ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۴ | اکتوبر ۱۹۶۵ء | عدد ۲

اشارات ——— عبدالحمید صدیقی ۲

تفہیم القرآن: ———

الاحقاف (۲) ابوالاعلیٰ مودودی ۱۷

مقالات: ———

خلافت اور ملوکیت کا فرق (۳) " " ۳۳

رسائل و مسائل: ———

سوالات و اعتراضات بسلسلہ بحث خلافت (۲) " ۴۶

سالانہ چندہ
سات روپے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن
۵-اے- ذیلدار پارک- اچھرہ، لاہور

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

بھارت نے قوت و طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر پاکستان کے خلاف جس جارحیت اور جس ظلم و زیادتی کا مظاہرہ کیا ہے وہ تاریخ کی ایک بڑی المناک داستان ہے اسے دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بھارت کے حکمرانوں کی صفیں شریف اور انصاف پسند اشخاص سے اب بالکل خالی ہو چکی ہیں اور وہاں کے مقتدر طبقہ کے پیشِ نظر اندھی بہری قوت سے پاکستان کو ختم کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ اُس کے سر میں صرف یہی ایک سودا سمایا ہوا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے اس خطہ کو برباد کر دیا جائے۔

بھارتی حکمرانوں کا یہ جارحانہ طرزِ عمل کسی وقتی ہیجان کا نتیجہ نہیں بلکہ جنگ کے جن شعلوں کو اُس نے آج بھڑکایا ہے اُس کی چنگاریاں قیامِ پاکستان سے بھی بہت پہلے ان کے دلوں میں سُلگ رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو ہندو نے دل کی گہرائیوں سے آج تک قبول نہیں کیا اور اُس کے قیام کو اُس نے ہمیشہ اپنی ناکامی کا داغ سمجھتے ہوئے اُسے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ تقسیمِ ملک سے پہلے نہتی مسلم آبادیوں پر جس وحشت اور بربریت کے مظاہرے کیے گئے، کشمیر میں جس بد دیانتی اور ظلم کے ساتھ وہاں کے عوام کو اُن کے حقِ خود ارادیت سے محروم رکھا گیا اور اب جن ناپاک عزائم کے ساتھ اپنے پڑوسی اور امن پسند ملک پر یلغار کی ہے، وہ سب اُس بغض و عناد کے گھناؤنے نتائج ہیں جنہیں وہ برسہا برس سے سینوں میں پال رہا ہے۔

پاکستان کا موقف اس معاملے میں بالکل واضح اور سو فیصد مبنی بر انصاف ہے اُس کا

دعویٰ یہ ہے کہ جب تقسیمِ ملک کے وقت یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہونگے، تو ہندوستان کو پہلے خود ہی کشمیر پاکستان کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ پھر ریاستوں کے بارے میں بھی یہ اصول مانا جا چکا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں سے کسی ایک کے ساتھ ان کے الحاق کا فیصلہ ان کے باشندوں کی مرضی سے ہوگا۔ مگر ہندوستان نے اس اصول کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور تقسیم کے زمانے کی مخصوص صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کشمیر پر قبضہ جما لیا۔ اس معاملہ میں ہندوستان نے جس مکروفریب، جس عیاری اور چالاکی، جس بدعہدی اور وعدہ خلافی، اور جس بے اصولی کا ثبوت دیا ہے وہ بڑی شرمناک ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم محض قوت کے بل بوتے پر ان سارے اخلاقی اصول وضوابط کو پامال کر رہی ہے جو ہمیشہ سے انسانیت کی اساس رہے ہیں۔ دنیا میں درندے بھی کچھ ضابطے رکھتے ہیں لیکن "اہنسا" کے علمبرداروں کا کوئی ضابطہ نہیں۔ جن سنگھ اور اسی قبیل کی دوسری مسلم کش جماعتیں اگر اس قسم کی دیوانگی کا مظاہرہ کریں تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن انسان اس وقت حیران وششدر رہ جاتا ہے جب وہ ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے اخوتِ انسانی کے دعویدار اور ونوبا بھاوے جیسے بھگت کی زبان سے اس وحشت کی تائید میں باتیں سنتا ہے، اس اندوہناک صورتِ حال کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بااثر طبقے میں اب کوئی ایک بھی رجلِ رشید نہیں رہا اور پوری قوم کا اخلاقی اعتبار سے دیوالہ نکل چکا ہے۔

پھر مسئلہ کشمیر کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ جو دنیا کی قوموں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہے، اس نے بھی پاکستان کے جائز اور برحق موقف کی تائید کے لیے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا بلکہ اب چند سالوں سے ایک ایسی روش اختیار کی ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے انتہائی ناپسندیدہ اور تباہ کن ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب کشمیری عوام نے اپنے مستقبل کے فیصلے کے لیے جدوجہد شروع کی اور پاکستان نے ان کے

اس جائز حق کے حصول کے لیے اُن کی طرف دستِ تعاون بڑھانا چاہا تو اقوامِ متحدہ فوراً درمیان میں کود پڑی اور اس نے اپنی قرارداد کے ذریعہ پوری دنیا کو یقین دلایا کہ ریاست کا الحاق وہاں کے باشندوں کی رائے سے ہوگا ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بار بار اس امر کا اعلان کیا کہ وادیٔ کشمیر میں امن بحال ہونے کے ساتھ ہی یو۔این۔او کی نگرانی میں رائے شماری کا انتظام کیا جائیگا اور کشمیری عوام کو اس بات کا پورا موقع دیا جائے گا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس طرح چاہیں ریاست کے الحاق کا فیصلہ کریں

یو۔این۔او جو عملی اعتبار سے امریکہ کی باندی ہے چند سال تک کشمیر کے بارے میں اپنی قرارداد کو وقتاً فوقتاً دُہراتی رہی لیکن قوت وطاقت رکھنے کے باوجود اس نے اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے سے ہمیشہ گریز کیا ۔ وہ اگر چاہتی تو کشمیر کا مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا ۔ لیکن چونکہ امریکہ ہندوستان کو ناراض نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ اشتراکی دنیا کے ابھرتے ہوئے اقتدار کے خلاف بھارت اور پاکستان دونوں کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے اس نے بڑی منافقانہ روش اختیار کی ۔ کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کو اور وہاں کے عوام پر اُس کے مظالم کو صبح و شام دیکھنے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ بڑا معنی خیز سکوت اختیار کیے رہا ۔ اس کے علاوہ بھارت کو ہر قسم کی امداد بھی دیتا رہا تا کہ اُسے احساس ہو کہ اُس کے اس غاصبانہ قبضے اور اخلاق سوز طرزِ عمل سے اُس کے آقائے ولی نعمت کے دل میں کوئی تکدر پیدا نہیں ہوا ۔ دوسری طرف امریکہ نے پاکستان کو کچھ مالی امداد دے کر اس کی آزادی کا سودا کرنا چاہا ۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ یہ قوم چند ڈالروں کے عوض اپنی عزت ۔ اپنی غیرت اور اپنی آزادی کو اس کے ہاتھ بیچ دے گی اور اُس کی غلامی کا قلادہ گلے میں پہننے کے بعد اُس کے سامراجی عزائم کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے نہ صرف کشمیر کے جائز حق سے دستبردار ہو گی بلکہ ہر اُس آگ میں اپنے آپ کو جھونکنے پر بھی آمادہ ہو جائے گی جس میں امریکہ اسے جھونکنا چاہتا ہے ۔

یو، این، او کی منافقانہ روش اور امریکہ کی یہ دو رنگی پالیسی کئی سال تک برابر چلتی رہی، یہاں تک کہ آج سے تین برس پیشتر "چچا سام" کے ناپاک عزائم بالکل کھل کر سامنے آگئے اور اُس نے چین کے خطرے کو بہانہ بنا کر ہندوستان کو بے حد و حساب فوجی امداد دینی شروع کر دی۔ پاکستان اور دوسرے انصاف پسند ممالک نے اُس کی اِن "نوازشات" پر سخت اعتراض کیا اور اس بات کا خدشہ ظاہر کیا کہ ان سے نہ صرف ایشیا میں توازنِ اقتدار بگڑے گا بلکہ کمزور قوموں کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہندوستان جس کے سر پر کئی برس سے جنگ کا جنون سوار ہے اور جس کی آنکھوں میں خوفناک خون جھلک رہا ہے، ان جدید ہتھیاروں سے لیس ہونے کے بعد پورے ایشیا کے امن کو غارت کر کے رکھ دیگا۔ مگر افسوس کہ کوئی احتجاج بھی امریکہ کے طرزِ فکر اور اُس کے طرزِ عمل کو متاثر نہ کر سکا اور اس نے نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر بھارت کی بپھری ہوئی قوم کو آن کی آن میں نہایت خوفناک ہتھیاروں سے مسلح کر دیا۔ اس نے یہ قدم اس بات سے بالکل بے پروا ہو کر اٹھایا تھا کہ یہ مدد چین کے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف استعمال ہو گی اور کشمیر کو ہضم کرنے کے لیے اس سے کام لیا جائیگا۔ اُس کی نظر میں امریکہ کے سامراجی عزائم دنیا کی ہر قیمتی سے قیمتی چیز سے زیادہ قابلِ ترجیح ہیں اور اسے کسی دوست کو اپنے ان عزائم پر قربان کر دینے میں تامل نہیں ہے۔

اہلِ کشمیر پورے سولہ سال تک یو، این، او پر آس لگائے بیٹھے رہے کہ شاید کسی وقت اس کے دل میں اپنے فرض کی ادائیگی کا احساس پیدا ہو اور وہ اپنی منظور شدہ قرارداد کے مطابق کشمیریوں کو اُن کا جائز حق دلوانے کے لیے آگے بڑھے۔ مگر افسوس کہ اہلِ کشمیر کی، اہلِ پاکستان کی، اور دنیا کی بعض دوسری انصاف پسند قوموں کی یاد دہانیوں کے باوجود یو این او کے دل میں کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی، بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس مسئلے کی طرف سے اس کی بے اعتنائی بڑھتی چلی گئی۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ سرے سے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا

کہ جس علاقے کی آبادی کو تمام دنیا کے سامنے حقِ خود اختیاری دلانے کا خود اس نے وعدہ کیا تھا اسے یہ حق ملتا ہے یا نہیں۔ اس نے ہندوستان کو علانیہ اہلِ کشمیر کے اس حق سے انکار کرتے دیکھا اور خاموشی اختیار کی۔ ہندوستان نے علی الاعلان کشمیر کو اپنے ملک کا ایک غیر منفک حصّہ قرار دے کر اسے زبردستی ہضم کرنے کی کوشش کی اور اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کشمیریوں نے اور پاکستان نے ہر ممکن طریق سے یو، این، او اور دنیا کی بڑی طاقتوں کو اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس دلایا اور انہیں یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا کہ اس معاملے میں ان کا یہ تغافل بڑے سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ دو ممالک کے درمیان کوئی وقتی یا ہنگامی نزاع نہیں بلکہ ایک قوم کی آزادی کا سوال ہے۔ یہ حق و انصاف کا مسئلہ ہے۔ یہ اندھی بہری طاقت کی یلغار ہے۔ امن پسند قوم کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ مگر افسوس کہ اس ضمن میں ساری کوششیں یو، این، او اور امریکہ کو حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یو، این او نے اس مسئلہ سے جس مجرمانہ تغافل کا ثبوت دیا ہے، اُسے دیکھ کر اس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اہلِ کشمیر کے لیے اس سنگین صورتِ حال کو ایک غیر معین عرصہ تک برداشت کرتے چلے جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ اس بات کے لیے سخت بے تاب تھے کہ اُن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ جن اداروں یا قوموں سے انہیں انصاف کے ملنے کی توقع تھی انہوں نے ذاتی مصالح کی بنا پر حق کا خون کیا ہے تو پھر انہوں نے مایوس ہو کر خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق کے حصول کا عزم کر لیا۔ اس غرض کے لیے ایک انقلابی کونسل معرضِ وجود میں آئی جس نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے سراسر ناجائز تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ پاکستان کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ حق و باطل اور ظلم و انصاف کی اس کشمکش میں ایک غیر متعلق تماشائی بن کر رہتا۔ اُس نے انقلابی کونسل کے اس اقدام کی تائید کی اور پوری

دنیا سے کھل کر کہا کہ یہ کونسل جو جدوجہد کر رہی ہے وہ اخلاقی اعتبار سے بالکل صحیح اور درست ہے اور پاکستان کی پوری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔

بھارت کے بدمست اقتدار نے اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے اسے اپنی بے پناہ قوت و طاقت کے مظاہرے کا ایک نادر موقع سمجھا اور مسلح فوجوں کے ذریعہ آزاد کشمیر پر اندھا دھند حملہ کر دیا، اور اس طرح اُس جنگ بندی لائن کو توڑ ڈالا جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ پھر اُس نے طاقت کے زعم میں خود پاکستان کے حدود کے اندر اعوان شریف پر شدید گولہ باری کی۔ پاکستان نے جب اس پر جوابی کارروائی کی تو اُس نے لاہور پر کسی اعلانِ جنگ کے بغیر رات کی تاریکی میں دفعتاً حملہ کر دیا۔ آج بھارت کا پریس اور اس کا ریڈیو پوری دنیا میں دہائی دے رہے ہیں کہ پاکستان نے ہم پر زیادتی کی ہے۔ لیکن پاکستان کی زیادتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت کے حملے کے وقت لاہور کی سرحد پر سوائے سٹلج رینجرز کی معمولی تعداد کے کوئی سپاہ نہ تھی۔ اگر پاکستان کی نیت جنگ کرنے کی ہوتی تو وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کا پوری طرح بندوبست کرتا اور دشمن کو مظالم ڈھانے کا ایک لمحہ کے لیے بھی موقع نہ دیتا۔ پاکستان اپنے ہمسایہ ملک بلکہ دنیا کے سارے ممالک کے ساتھ ہمیشہ امن اور دوستی کا خواہاں رہا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ حملے کے دن تک اس کی نشرگاہوں سے ایک لفظ بھی ایسا نشر نہیں ہوا جو لوگوں کو جنگ پر اُبھارنے والا ہو۔ اس کے مقابلے میں بھارت کے اخبارات کا مطالعہ کیجیے اور اس کی نشریات سُنیے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کی عظیم اکثریت کے سر پر ۱۸ سال سے جنگ کا بھوت سوار ہے۔

لاہور پر بھارت کا اچانک حملہ کمینگی کا نہایت ہی اوچھا وار ہے۔ اس کے ذریعہ اُس نے پاکستان کی اُس سرحد کو توڑا ہے جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ بھارت پاکستان کو غلام بنانے کا ناپاک عزم لیکر آگے بڑھا ہے۔ یہ ہماری آزادی کو چیلنج ہے اور اس کا جواب دینا ہمارا دینی فرض ہے۔ ہم نے خود جنگ کو دعوت نہیں دی بلکہ بھارت نے اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں جنگ ہم پر ٹھونس دی ہے۔ ان حالات میں ہمارے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم ایک مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے آگے بڑھیں۔ بھارت نے تمام اخلاقی حدود کو نظر انداز کرتے ہوئے جس طرح بے گناہ شہری آبادیوں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ دشمن انسانیت کے تمام شریفانہ جذبات سے یکسر تہی دامن ہے۔

لاہور اور اس کے بعد سیالکوٹ پر جس خطرناک اسلحہ اور خوفناک ہتھیاروں سے حملہ کیا گیا ہے اور پشاور، کوہاٹ، سرگودھا، لائل پور، ملتان، کراچی، رائے ونڈ، نارووال اور اسی طرح کی دوسری بے شمار شہری آبادیوں پر جس بے دردی کے ساتھ بم گرائے ہیں وہ اہنسا اور امن کے پجاریوں کے سیاہ باطن کی کھلی شہادت ہیں۔ ان لوگوں کی شقاوتِ قلبی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے سیالکوٹ اور کوہاٹ میں ہسپتالوں پر بمباری کی اور پشاور میں مساجد بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

ان حالات میں اہلِ پاکستان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اپنے اس مقدس ملک کی، جسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے حاصل کیا گیا تھا، پوری طرح حفاظت کریں۔ قرآن مجید اور سنتِ نبوی میں جہاد کی جو مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں اُن میں ایک قسم دفاعی جہاد کی ہے جو اس وقت ہم سب پر فرض ہو گیا ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۔ (البقرہ۔ آیت ۱۹۰)	اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ (الحج ۳۹ - ۴۰)	اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے ۔ اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔

اسلام میں جہاد دوسری عبادات کی طرح ایک عبادت ہے اس لیے ایک مسلمان کو اس میں اُسی خلوص اور جذب و شوق سے شریک ہونا چاہیے جس طرح کہ وہ دوسرے فرائض ادا کرنے کا متمنی رہتا ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (النساء - آیت ۷۷)	تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو ۔ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں، جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر ۔

پھر ایک دوسرے مقام پر جہاد سے گریز کرنے والوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں کو آخرت کے مقابلے میں اِس دنیا کی چند روزہ زندگی زیادہ عزیز ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۔ (التوبہ - ۳۸)	اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ۔

جہاد کو اسلامی عبادات میں کتنی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک موقع پر یہ فرمایا کہ جو مسلمان زندگی میں جہاد کیے بغیر یا اس کی آرزو اور تمنا کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جائے اُس کی موت ایک مومنِ صادق کی موت نہیں بلکہ منافق کی موت[1] ہے۔

جب جہاد کو اسلام نے ایک عبادت قرار دیا ہے تو لامحالہ اُس نے دیگر عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی طرح اس کے بھی کچھ آداب مقرر کیے جن کی تفصیل قرآن و سنّت میں ملتی ہے:

قرآنِ حکیم میں جہاد کے جتنے احکام درج ہیں اُن میں ہر جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جہاد خالصتہً اللہ کی راہ میں ہو اور اس کے پیچھے کوئی دوسری غرض کارفرما نہ ہو۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرہ ۲۴۴)
اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں اس بات کا علم اُس سمیع و علیم ہستی کو ہے کہ کون کس غرض کے لیے آمادۂ پیکار ہے۔ جہاد کے لیے خلوص نیت پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے بہت سے مقامات پر اس کی صراحت فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کے ارادہ سے نکلتا ہے لیکن اس سے اُس کی غرض دنیاوی مال و متاع کا حصول ہے تو کیا اس شخص کو بھی ثواب ملے گا؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اسے اس سعی و جہد کا اللہ کے ہاں کوئی صلہ نہ ملے گا۔ لوگوں نے جب یہ بات سنی تو انہیں کچھ تعجب ہوا اور اُس شخص کو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی۔ اس نے پھر دریافت کیا تو حضور سرورِ دو عالم نے دوبارہ وہی جواب دیا جو پہلے ارشاد فرما چکے تھے۔ اس شخص نے اسی

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد، باب ذم من مات ولم یغز و لم یحدث نفسہ بالغزو

امر کی تیسری بار صراحت چاہی تو حضورؐ نے تیسری مرتبہ بھی یہی بات ارشاد فرمائی۔[1]

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ دنیا کمانے کے لیے یا اپنی شہرت اور بہادری کا سکہ جمانے کی غرض سے جنگ نہیں کرتا بلکہ دنیا کی عارضی زندگی اور اس کے فانی مال ومتاع کے عوض آخرت کی ابدی اور اُس کی غیر فانی آسائشوں کا سودا کرتا ہے۔ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے جان کی بازی لگاتا ہے، بے کسوں اور بے بسوں کو ظلم واستبداد سے بچانے کے لیے، اور عورتوں کی عفت وعصمت کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے اپنی متاعِ حیات کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۔ (النساء: ۷۵)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی ومددگار پیدا کر دے۔

جہاد کا مقصد اور اُس کی غرض وغایت بیان کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم دورانِ جہاد اللہ اور اُس کے رسول کی دی ہوئی ہدایات کو بھی برابر نگاہ میں رکھیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جب تم محض اللہ کی رضا کے حصول کے لیے میدانِ عمل میں نکل رہے ہو تو تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ تم اللہ کو ہر آن یاد کرتے رہو۔ دوسرے تمہارے اندر غرور اور تکبّر کا کوئی شائبہ تک نہ ہو بلکہ تم اللہ کے عاجز بندے بن کر، اُسی پر بھروسہ اور توکّل کرتے ہوئے آگے بڑھو۔ آپس میں محبّت، اخوت اور احساسِ ہمدردی پیدا

[1] ابوداؤد: کتاب الجہاد: باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا

کرو۔ کسی وقتی ہیجان یا جوش میں آکر کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے تمہارے ساتھی تم سے کبیدۂ خاطر ہوں۔ اپنے امیر لشکر کی پوری پوری اطاعت کرو کیونکہ میدانِ جنگ میں تم جس قدر نظم وضبط اور اطاعتِ امر کا ثبوت دوگے اتنا ہی تمہارے قدم آگے بڑھیں گے۔ پھر مقابلہ کے وقت تمہارے پائے استقلال میں قطعاً کوئی لغزش نہ پیدا ہونی چاہیے اور تمہیں ہر حال میں بڑی ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۔

(الانفال ۔ ۴۵ تا ۴۷)

اے ایمان والو جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو:

۱۔ ثابت قدم رہو

۲۔ اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔

۳۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

۴۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(۵) اور اُن لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں۔

پھر اسی سلسلہ میں مسلمانوں کو اس امر کی تلقین بھی کی گئی ہے کہ جب وہ محض خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے جہاد کے لیے نکلیں تو انہیں فتح و کامرانی کے لیے لازمی طور پر صرف اُسی قادرِ مطلق ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری پوری تیاری کرے، اس کے لیے جتنا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کر سکتا ہے اُس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے لیکن فتح کے لیے ان دنیاوی اسباب کا سہارا لینے کے بجائے اُس مسبب الاسباب کا سہارا لے جس کے دستِ قدرت میں فتح و کامرانی کی کلید ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(التوبہ ۔ ۲۵-۲۶)

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بھی منکشف فرمایا ہے کہ کافر اگر میدانِ جنگ سے منہ موڑتا ہے تو اُس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ زندگی اور موت اُس کے اپنے اختیار میں ہے اس لیے وہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے۔ دوسرے وہ موت سے اس لیے گھبراتا ہے کہ اِس دنیا کی زندگی ہی اُس کا اصل سرمایہ ہے، اس دنیا سے پرے موت کی سرحد عبور کرنے کے بعد اُسے بجز تاریکی اور خوف کے کچھ نظر نہیں

آتا - لیکن ایک مسلمان کا معاملہ اُس کے بالکل برعکس ہے - یہ دنیا اُس کے نزدیک محض امتحان اور آزمائش ہے - اُس کی حقیقی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اس آزمائش پر پورا اُتر کر انعام و اکرام پانے کے لیے بارگاہِ ایزدی میں پیش ہوتا ہے - دوسرے حیات و ممات اُس کے عقیدہ کے مطابق اُس کے اپنے بس میں نہیں بلکہ اُس کے ہاتھ میں ہے جس نے اُسے پیدا کیا ہے -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ - وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ - (آل عمران - ۱۵۶ - ۱۵۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اُن کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے - اللہ اس قسم کی باتوں کو اُن کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگران ہے اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصے میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں -

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا :

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ - (النساء ۱۰۴)

اور گروہ کفار کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو کافر نہیں رکھتے -

جہاد کے سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت یہ بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس کی ذمہ داری صرف اُن لوگوں پر ہی عائد نہیں ہوتی جنہیں میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابلے پر لڑنے کا حکم ملتا ہے بلکہ اس کے لیے ہر اُس شخص کو اپنا تن، من دھن ہر وقت قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ دارالاسلام پر حملہ کی صورت میں جہاد پوری ملت پر فرض ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کو دشمن سے لڑنے کے احکام صادر ہو جائیں انہیں یہ فرض میدانِ جنگ میں بڑی ثابت قدمی سے ادا کرنا چاہیے اور باقی امت کو نہ صرف ان جاں نثاروں کی ذمہ داریاں سنبھالنی چاہییں بلکہ تمام وہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں جن سے انہیں تقویت حاصل ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مقامات پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے بنی لحیان کی طرف ایک لشکر روانہ کیا اور پھر ارشاد فرمایا کہ دو شخصوں میں سے ایک میدانِ جنگ کے لیے نکلے۔ باقی جو گھروں میں رہ گئے انہیں یہ تلقین فرمائی کہ اگر تم نے میدانِ جنگ میں شریک ہونے والوں کے گھر بار کی اچھی طرح خبر گیری کی تو تمہیں اُن سے نصف ثواب ملے گا۔[1]

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا کہ غازیوں کی ازواج کی حرمت خانہ نشینوں پر ایسی ہے جیسے ان کی ماؤں کی حرمت۔ اگر کوئی خانہ نشین ان بے کس عورتوں کو بُری نیت سے دیکھے تو قیامت کے دن ایسے بدطینت شخص کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے مجاہد سے کہا جائے گا کہ تم اس ظالم کی جتنی نیکیاں چاہتے ہو لے لو۔[2]

اس کے علاوہ کئی احادیث میں مسلمانوں کو اس بات کی تلقین فرمائی کہ انہیں راہِ خدا میں لڑنے والوں کی ہر طرح مدد کرنی چاہیے اور اس معاملے میں کسی بخل سے کام نہ لینا چاہیے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ بارگاہِ رسالت میں قبیلہ اسلم کا ایک جوان حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الجہاد

[2] ایضاً

میں جہاد کے لیے آرزو مند ہوں مگر میرے پاس سازوسامان نہیں۔ حضور نے اُسے ایک ایسے شخص کے پاس جانے کا حکم دیا جس نے جہاد کی پوری طرح تیاری کر رکھی تھی لیکن عین وقت پر بیمار پڑ گیا۔ یہ نوجوان اُس کے گھر گیا اور اُسے حضور کا پیغام دیا۔ اُس شخص نے اطلاع پاتے ہی اپنی خادمہ سے کہا کہ اس مجاہد کو پورا سامان دے دو، اور اس میں سے کوئی چیز بچا کر نہ رکھنا۔ خدا کی قسم تو جو شے بچا کر رکھے گی اس میں قطعاً برکت نہ رہے گی۔[1]

پھر دوسری جگہ حضور نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللهِ فقد غزا ومن خلفهٗ فی اھلہ بخیر فقد غزا۔[2]	جس شخص نے کسی غازی کو سامان فراہم کیا تو اُس نے گویا جہاد کیا اور جس نے غازی کے گھر بار کی خبر رکھی اُس نے بھی جہاد کیا۔

جہاد کے لیے جتنی جان کی قربانی ضروری ہے اتنی ہی مال کی قربانی بھی لازمی ہے۔ کیونکہ مال کے بغیر جہاد کے لیے کما حقہٗ تیاری نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مال و جان دونوں کو راہِ خدا میں قربان کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات - ۱۵)	حقیقی مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لے آئے پھر (اس میں کبھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے اترنے والے ہیں۔

مفسرین کرام نے مال کی جان پر تقدیم کے کئی ایک اسباب بیان فرمائے ہیں۔ ان سب

(باقی آخر میں)

---

[1] صحیح مسلم - کتاب الجہاد، باب فضل اعانۃ الغازی فی سبیل اللہ

[2] ایضاً

تفہیم القرآن

الاحقاف

(۲)

اِن لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سُنائی جاتی ہیں اور حق اِن کے سامنے آجاتا ہے تو یہ کافر لوگ اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھُلا جادو ہے۔[۵] کیا اُن کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے

[۵] اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کی آیات کفارِ مکہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ صاف یہ محسوس کرتے تھے کہ اِس کلام کی شان انسانی کلام سے بدرجہا بلند ہے۔ ان کے کسی شاعر، کسی خطیب، اور کسی بڑے سے بڑے ادیب کے کلام کو بھی قرآن کی بے مثل فصاحت و بلاغت، اس کی وجد آفریں خطابت، اس کے بلند مضامین اور دلوں کو برما دینے والے اندازِ بیان سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام کی شان بھی وہ نہ تھی جو خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہونے والے کلام میں نظر آتی تھی۔ جو لوگ بچپن سے آپ کو دیکھتے چلے آرہے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ آپ کی زبان اور قرآن کی زبان میں کتنا عظیم فرق ہے، اور ان کے لیے یہ باور کرنا ممکن نہ تھا کہ ایک آدمی جو چالیس پچاس برس سے شب و روز ان کے درمیان رہتا ہے وہ یکایک کسی وقت بیٹھ کر ایسا کلام گھڑ لیتا ہے جس کی زبان میں اُس کی اپنی جانی پہچانی زبان سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز ان کے سامنے حق کو بالکل بے نقاب کر کے لے آتی تھی، مگر وہ چونکہ اپنے کفر پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لیے اس صریح علامت کو دیکھ کر سیدھی طرح اِس کلام کو کلامِ وحی مان لینے کے بجائے یہ بات بناتے تھے کہ یہ کوئی جادو کا کرشمہ ہے۔ (ایک اور پہلو جس کے لحاظ سے وہ قرآن کو جادو قرار دیتے تھے، اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۴۵ - ۱۴۶۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص، حاشیہ ۵)۔

اسے خود گھڑ لیا ہے ؟ ان سے کہو "اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے ، جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے ، میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی کے لیے کافی ہے۔ اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔"

ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں ، میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا ، میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے ،

۹ اس سوالیہ طرزِ بیان میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اتنے بے حیا ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن خود گھڑ لانے کا الزام رکھتے ہیں ، حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ اُن کا تصنیف کردہ کلام نہیں ہو سکتا ، اور ان کا اسے سحر کہنا خود اس امر کا صریح اعتراف ہے کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے جس کا کسی انسان کی تصنیف ہونا ان کے اپنے نزدیک بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰ چونکہ اُن کے الزام کا محض بے اصل اور سراسر ہٹ دھرمی پر مبنی ہونا بالکل ظاہر تھا اس لیے اس کی تردید میں دلائل پیش کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی ۔ بس یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اگر واقعی میں نے خود ایک کلام تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب کرنے کا جرم عظیم کیا ہے ، جیسا کہ تم الزام رکھتے ہو تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے تم نہ آؤ گے ، لیکن اگر یہ خدا ہی کا کلام ہے اور تم جھوٹے الزامات رکھ رکھ کر اسے رد کر رہے ہو تو اللہ تم سے نمٹ لے گا ۔ حقیقت اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے ، اور جھوٹ سچ کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ بالکل کافی ہے ۔ ساری دنیا اگر کسی کو جھوٹا کہے اور اللہ کے علم میں وہ سچا ہو تو آخری فیصلہ لازماً اسی کے حق میں ہو گا ۔ اور ساری دنیا اگر کسی کو سچا کہہ دے ، مگر اللہ کے علم میں وہ جھوٹا ہو ، تو آخر کار وہ جھوٹا ہی قرار پائے گا ۔ لہٰذا الٹی سیدھی باتیں بنانے کے بجائے اپنے انجام کی فکر کرو۔

۱۱ اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے ۔ ایک یہ کہ فی الواقع یہ اللہ کا رحم اور اس کا درگزر ہی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ زمین میں سانس لے رہے ہیں جنہیں خدا کے کلام کو افترا قرار دینے میں کوئی باک نہیں ، ورنہ کوئی بے رحم اور سخت گیر خدا اس کائنات کا مالک ہوتا تو ایسی جسارتیں کرنے والوں

اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔[۲۱] اے نبی، ان سے
کہو "کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا تو تمہارا

کو ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوتا۔ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ ظالمو، اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آجاؤ تو خدا کی رحمت کا دروازہ تمہارے لیے کھلا ہوا ہے، اور جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے وہ معاف ہو سکتا ہے۔

۲۱ اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اس شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اردلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے، اور ہر اُس شخص پر عذاب کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے اور پھر اسے یونہی مکے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آجائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو، اس کے ایک اشارے پر پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کشت زار میں تبدیل ہو جائیں، اس کو تمام ماکان و مایکون کا علم ہو اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

یہی باتیں ہیں جن کا جواب اِن فقروں میں دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر فقرے کے اندر معانی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

کیا انجام ہوگا؟ ؎؎ اور اِس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔
ع وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے ؎۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا ؎

فرمایا، ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں"۔ یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمہیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں، اور میں ان سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو، یا کھاتا پیتا نہ ہو، یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ اترا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہو اور اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے اور کس نے خدا کی طرف بلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کونسا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آرہے ہو؟

اس کے بعد فرمایا کہ ان کے جواب میں یہ بھی کہو "میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے"۔ یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمہارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے۔ جس چیز کا وحی کے ذریعہ سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے بس اُسی کو میں جانتا ہوں۔ اس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے آخر کب دعویٰ کیا تھا، اور کونسا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتائے، یا یہ بتائے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتائے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا۔

آخر میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو "میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں"۔ یعنی میں خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہوں کہ وہ عجیب و غریب معجزے تمہیں دکھاؤں جن کے مطالبے تم مجھ سے آئے دن کرتے رہتے ہو۔ مجھے جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ

لوگوں کے سامنے راہ راست پیش کردوں اور جو لوگ اسے قبول نہ کریں انہیں بُرے انجام سے خبردار کردوں۔

۱۳ یہ وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے ایک دوسرے طریقہ سے سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ مذکور، حاشیہ ۶۹۔

۱۴ مفسرین کے ایک بڑے گروہ نے اس گواہ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام کو لیا ہے جو مدینۂ طیبہ کے مشہور یہودی عالم تھے اور ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ یہ واقعہ چونکہ مدینہ میں پیش آیا تھا اس لیے ان مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد حضرت سعد بن ابی وقاص کا یہ بیان ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی تھی (بخاری، مسلم، نسائی، ابن جریر)، اور اسی بنا پر ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ضحاک، ابن سیرین، حسن بصری، ابن زید اور عوف بن مالک الاشجعی جیسے متعدد اکابر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ مگر دوسری طرف عکرمہ اور شعبی اور مسروق کہتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ پوری سورت مکی ہے۔ ابن جریر طبری نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اوپر سے سارا سلسلۂ کلام مشرکین مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے چلا آرہا ہے اور آگے بھی سارا خطاب انہی سے ہے، اس سیاق و سباق میں یکایک مدینے میں نازل ہونے والی ایک آیت کا آجانا قابلِ تصوّر نہیں ہے۔ بعد کے جن مفسرین نے اس دوسرے قول کو قبول کیا ہے وہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت کو رد نہیں کرتے، بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت چونکہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ایمان لانے پر بھی چسپاں ہوتی ہے، اس لیے حضرت سعد نے قدماء کی عادت کے مطابق یہ فرما دیا کہ یہ ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب وہ ایمان لائے اس وقت انہی کے بارے میں یہ نازل ہوئی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس آیت کے ٹھیک مصداق ہیں اور ان کے قبول ایمان پر یہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔

بظاہر یہی دوسرا قول زیادہ صحیح اور معقول محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس "گواہ" سے مراد کون ہے۔ جن مفسرین نے اس دوسرے قول کو اختیار کیا ہے ان میں سے بعض

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے [۱۵]

کہتے ہیں کہ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ لیکن بعد کا یہ فقرہ کہ "وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے" اس تفسیر کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ زیادہ صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو مفسرین یا بوری اور ابن کثیر نے بیان کی ہے کہ یہاں گواہ سے مراد کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کا ایک عام آدمی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ قرآن مجید جو تعلیم تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے یہ کوئی انوکھی چیز بھی نہیں ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ تمہارے ہی سامنے پیش کی گئی ہو اور تم یہ عذر کر سکو کہ ہم یہ نرالی باتیں کیسے مان لیں جو نوعِ انسانی کے سامنے کبھی آئی ہی نہ تھیں۔ اس سے پہلے یہی تعلیمات اسی طرح وحی کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کے سامنے توراۃ اور دوسری کتبِ آسمانی کی شکل میں آچکی ہیں، اور ان کا ایک عام آدمی اُن کو مان چکا ہے، اور یہ بھی تسلیم کر چکا ہے کہ اللہ کی وحی اِن تعلیمات کے نزول کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تم لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وحی اور یہ تعلیمات ناقابلِ فہم چیزیں ہیں۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ تمہارا غرور و تکبر اور بے بنیاد گھمنڈ ایمان لانے میں مانع ہے۔

۱۵ یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند ناتجربہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجہ کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ، جو دانا اور جہاندیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو رد کر دیں۔ اِس پُر فریب استدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور رہا کرو۔

چونکہ انہوں نے اُس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے[۱۶] حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے، اور یہ کتاب اُس کی تصدیق کرنے والی زبانِ عربی میں آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبّہ کر دے[۱۷] اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔ یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اُس پر جم گئے، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے[۱۸]۔ ایسے سب لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اپنے اُن اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دُودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے[۱۹]۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور

[۱۶] یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں وہ ضرور ضلالت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسے "نیا جھوٹ" کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں، اور تمام کتب آسمانی جو اہلِ کتاب کے پاس موجود ہیں، انہی عقائد اور انہی ہدایات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ اسے "پرانا جھوٹ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے ان تعلیمات کو پیش کرتے اور مانتے چلے آ رہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصے میں آگئی ہے۔

[۱۷] یعنی اُن لوگوں کو انجامِ بد سے خبردار کر دے جو اللہ سے کفر اور غیر اللہ کی بندگی کر کے اپنے اوپر اور حق و صداقت پر ظلم کر رہے ہیں، اور اپنی اس گمراہی کی وجہ سے اخلاق اور اعمال کی اُن برائیوں میں مبتلا ہیں جن سے انسانی معاشرہ طرح طرح کے مظالم اور بے انصافیوں سے بھر گیا ہے۔

[۱۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ نمبر ۳۳ تا ۳۶۔

[۱۹] یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن ماں کا حق اپنی اہمیت میں اس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیفیں اٹھاتی ہے۔ یہی

بات اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مُسند احمد، اور امام بخاری کی ادب المفرد میں وارد ہوئی ہے کہ ایک صاحب نے حضور سے پوچھا کس کا حق خدمت مجھ پر زیادہ ہے ؟ فرمایا تیری ماں کا۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ؟ فرمایا تیری ماں۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ؟ فرمایا تیری ماں۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ؟ فرمایا تیرا باپ۔ حضور کا یہ ارشاد ٹھیک ٹھیک اِس آیت کی ترجمانی ہے، کیونکہ اس میں بھی ماں کے تہرے حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (۱) اس کی ماں نے اسے مشقت اٹھا کر پیٹ میں رکھا۔ (۲) مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا۔ (۳) اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں ۳۰ مہینے لگ گئے۔

اِس آیت، اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۴، اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ سے ایک اور قانونی نکتہ بھی نکلتا ہے جس کی نشان وہی ایک مقدمے میں حضرت علی اور حضرت ابنِ عباس نے کی اور حضرت عثمان نے اسی کی بنا پر اپنا فیصلہ بدل دیا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک شخص نے قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور شادی کے چھ ہی مہینے بعد اس کے ہاں صحیح و سالم بچہ پیدا ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت عثمان کے سامنے لا کر یہ معاملہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس عورت کو زانیہ قرار دے کر حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے یہ قصہ سنا تو فوراً حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور کہا یہ آپ نے کیا فیصلہ کر دیا ؟ انہوں نے جواب دیا کہ نکاح کے چھ مہینے بعد اس نے زندہ سلامت بچہ جن دیا، کیا یہ اس کے زانیہ ہونے کا کھلا ثبوت نہیں ہے ؟ حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کی مذکورۂ بالا تینوں آیتیں ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دُودھ پلائیں اُس باپ کے لیے جو رضاعت کی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔" سورۂ لقمان میں فرمایا "اور دو سال اس کا دُودھ چھوٹنے میں لگے۔" اور سورۂ احقاف میں فرمایا "اس کے حمل اور اس کا دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگے۔" اب اگر تیس مہینوں میں سے رضاعت کے دو سال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدت جس میں زندہ سلامت بچہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے۔ لہٰذا جس عورت نے نکاح کے چھ مہینے بعد بچہ جنا ہو اسے تہمہ

قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت علیؓ کا یہ استدلال سن کر حضرت عثمانؓ نے فرمایا اس بات کی طرف میرا ذہن بالکل نہ گیا تھا۔ پھر آپ نے عورت کو واپس بلوایا اور اپنا فیصلہ بدل دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کے اس استدلال کی تائید حضرت ابنِ عباس نے بھی کی اور اس کے بعد حضرت عثمان نے اپنے فیصلے سے رجوع فرما لیا (ابن جریر، احکام القرآن للجصاص، ابن کثیر)۔

ان تینوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) جو عورت نکاح کے بعد چھ مہینے سے کم مدت میں صحیح و سالم بچہ جنے (یعنی وہ اسقاط نہ ہو بلکہ وضع حمل ہو)، وہ زانیہ قرار پائے گی اور اس کے بچے کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

(۲) جو عورت نکاح کے چھ مہینے بعد یا اس سے زیادہ مدت میں زندہ سلامت بچہ جنے اس پر زنا کا الزام محض اس ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا، نہ اس کے شوہر کو اس پر تہمت لگانے کا حق دیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کا شوہر بچے کے نسب سے انکار کرسکتا ہے۔ بچہ لازماً اسی کا مانا جائے گا۔ اور عورت کو سزا نہ دی جائے گی۔

(۳) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس عمر کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں قرار نہیں پائے گی اور نہ وہ احکامِ رضاعت اس پر مترتب ہوں گے جو سورۂ نساء آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں امام ابو حنیفہ نے بر سبیلِ احتیاط دو سال کے بجائے ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے تاکہ حرمتِ رضاعت جیسے نازک مسئلے میں خطا کر جانے کا احتمال باقی نہ رہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ لقمان، حاشیہ ۲۳)

اِس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نشوونما پاکر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے، کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور ایک بچے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اُس کی نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے، دونوں کو اُس کے قانونی

چالیس سال کا ہوگیا تو اس نے کہا "اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیری اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں، اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو[۵۰]، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سُکھ دے، مَیں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابعِ فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں"۔ اِس طرح کے لوگوں سے ہم اُن کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی بُرائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں[۵۱]۔ یہ جنّتی لوگوں میں شامل ہونگے اُس سچے وعدے کی بنا پر جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا "اُف، تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ مَیں مرنے کے بعد پھر قبر سے نکالا

نتائج سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتیٰ کہ خود حاملہ عورت اور اُسے بارور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم سے کم قانونی مدت کے تعین میں چند روز کی مزید گنجائش رکھی جائے۔

۵۰؎ یعنی مجھے ایسے نیک عمل کی توفیق دے جو اپنی ظاہری صورت میں بھی ٹھیک ٹھیک تیرے قانون کے مطابق ہو، اور حقیقت میں بھی تیرے ہاں مقبول ہونے کے لائق ہو۔ ایک عمل اگر دنیا والوں کے نزدیک بڑا اچھا ہو، مگر خدا کے قانون کی پیروی اس میں نہ کی گئی ہو، تو دنیا کے لوگ چاہے اس پر کتنی ہی داد دیں خدا کے ہاں وہ کسی داد کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف ایک عمل ٹھیک ٹھیک شریعت کے مطابق ہوتا ہے اور بظاہر اس کی شکل میں کوئی کسر نہیں ہوتی، مگر نیت کی خرابی، ریا، خود پسندی، فخر و غرور، اور دنیا طلبی اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

۵۱؎ یعنی دنیا میں انہوں نے جو بہتر سے بہتر عمل کیا ہے، آخرت میں ان کا درجہ اُسی کے لحاظ سے مقرر کیا جائے گا، اور ان کی لغزشوں، کمزوریوں اور خطاؤں پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک کریم النفس اور قدر شناس آقا اپنے خدمت گزار اور وفادار ملازم کی قدر اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی کسی ایسی خدمت کے لحاظ سے کرتا ہے جس میں اس نے

جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (اُن میں سے تو کوئی اٹھ کر نہ آیا)۔ ماں باپ اللہ کی دوہائی دے کر کہتے ہیں " ارے بدنصیب، مان جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے "۔ مگر وہ کہتا ہے " یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں "۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔[۲۲] دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔[۲۳] پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: " تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے

کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، یا جاں نثاری و وفاشعاری کا کمال کر دکھایا ہو۔ اور ایسے خادم کے ساتھ وہ یہ معاملہ نہیں کیا کرتا کہ اس کی ذرا ذرا سی کوتاہیوں پر گرفت کر کے اس کی ساری خدمات پر پانی پھیر دے۔

۲۲؎ یہاں دو طرح کے کردار آمنے سامنے رکھ کر گویا سامعین کے سامنے یہ خاموش سوال رکھ دیا گیا ہے کہ بتاؤ، ان دونوں میں سے کونسا کردار بہتر ہے۔ اُس وقت یہ دونوں ہی کردار معاشرے میں عملاً موجود تھے اور لوگوں کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ پہلی قسم کا کردار کہاں پایا جاتا ہے اور دوسری قسم کا کہاں۔ یہ جواب ہے سردارانِ قریش کے اس قول کا کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ چند نوجوان اور چند غلام اس معاملہ میں ہم سے بازی نہ لے جا سکتے تھے۔ اس جواب کے آئینے میں ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ ماننے والوں کا کردار کیا ہے اور نہ ماننے والوں کا کیا۔

۲۳؎ یعنی نہ اچھے لوگوں کی نیکیاں اور قربانیاں ضائع ہوں گی، نہ بُرے لوگوں کو ان کی واقعی بُرائی سے بڑھ کر سزا دی جائے گی۔ نیک آدمی اگر اپنے اجر سے محروم رہ جائے، یا اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجر پائے تو یہ بھی ظلم ہے، اور بُرا آدمی اپنے کیے کی سزا نہ پائے، یا جتنا کچھ قصور اس نے کیا ہے اس سے زیادہ سزا پا جائے تو یہ بھی ظلم ہے۔

اٹھالیا، اب جو تکبّر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں اُن کی پاداش میں تم کو ذلّت کا عذاب دیا جائے گا؏[۲۴] ع ۲

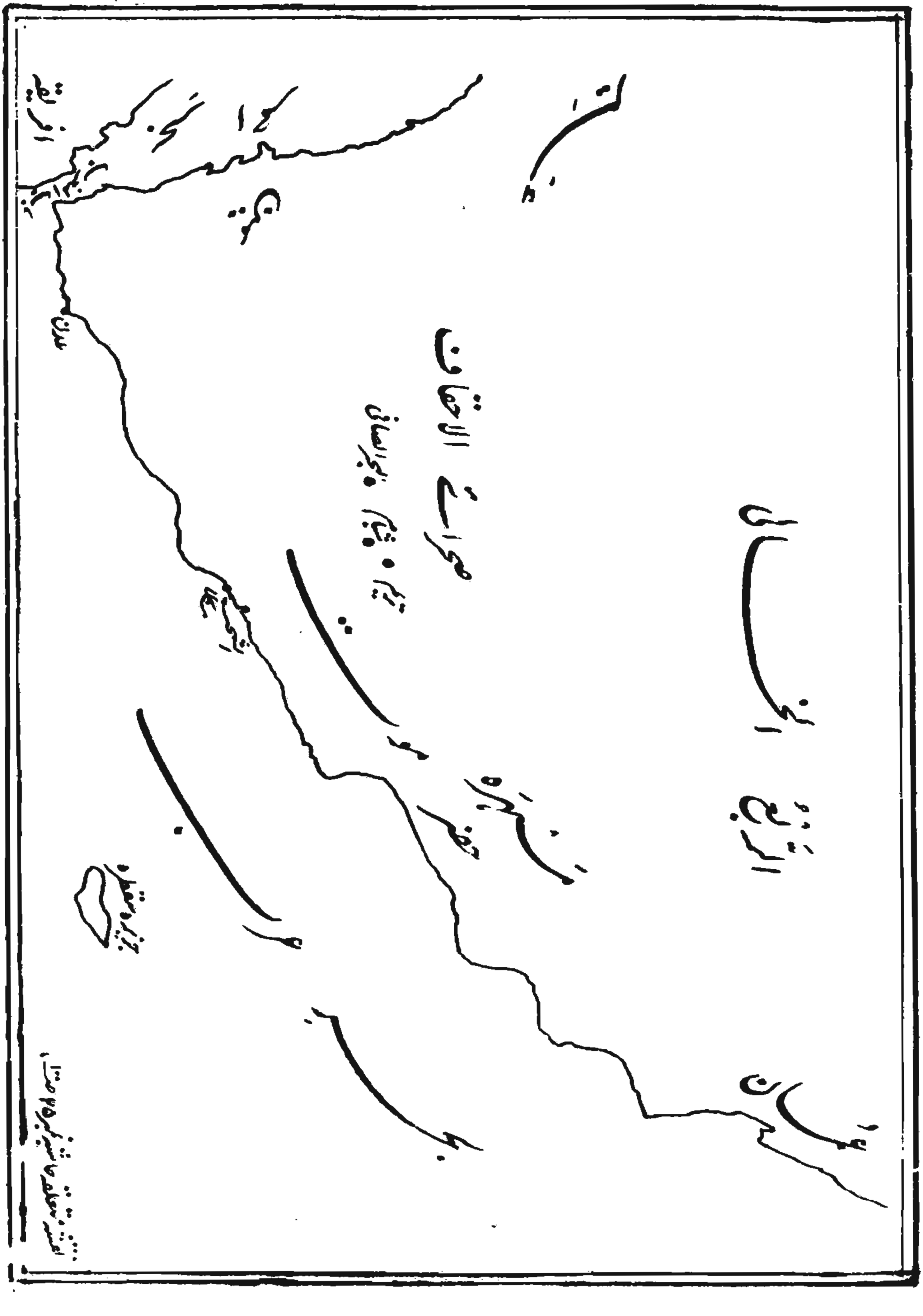
ذرا انہیں عاد کے بھائی (ہودؑ) کا قصّہ سناؤ جبکہ اُس نے اَحقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا[۲۵] ——— اور ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے ——— کہ "اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔" انہوں نے کہا "کیا تو اِس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا

۲۴۔ ذلّت کا عذاب اُس تکبُّر کی مناسبت سے ہے جو انہوں نے کیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رسول پر ایمان لا کر غریب اور فقیر مومنوں کے گروہ میں شامل ہو جانا ان کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ جس چیز کو چند غلاموں اور بے نوا انسانوں نے مانا ہے اسے ہم جیسے بڑے لوگ مان لیں گے تو ہماری عزت کو بٹہ لگ جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے غرور کو خاک میں ملا کر رکھ دیگا۔

۲۵۔ چونکہ سردارانِ قریش اپنی بڑائی کا زعم رکھتے تھے اور اپنی ثروت و مشیخت پر پھولے نہ سماتے تھے، اس لیے یہاں ان کو قومِ عاد کا قصہ سنایا جا رہا ہے جس کے متعلق عرب میں مشہور تھا کہ قدیم زمانے میں وہ اس سرزمین کی سب سے زیادہ طاقتور قوم تھی۔

اَحقاف، حِقف کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے ایسے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں۔ لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب، الرّبعُ الخالی کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ نقشے میں اس کا مقام ملاحظہ ہو:

←


عُمان
الرّبعُ الخالی
مَشہرہ
حضرموت
بحرِ عرب
صحرائے الاحقاف
تریم
شبام
البحر الصافی
یمن
بحر احمر
الشحر
مکلا
عدن
افریقہ
جزیرہ سقطرہ
نقشہ متعلقہ حاشیہ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۰۱

(بقیہ حاشیہ ۲۵) ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عُمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا، اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا جہاں سے نکل کر وہ گردوپیش کے ممالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اِسی علاقے میں آباد تھے موجودہ شہر مُکلّا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حضرموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہودؑ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبرِ ہود کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۱۵ شعبان کو وہاں عُرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصّوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مقامی روایات اسی علاقے کو قومِ عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرموت میں متعدد خرابے (RUINS) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصّوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دُور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا، اور اُس رسّی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ مفصل معلومات کے لیے

ہے اگر واقعی تو سچا ہے"۔ اُس نے کہا کہ "اس کا علم تو اللہ کو ہے[۲۶]، میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا
رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو[۲۷]"
پھر جب انہوں نے اُس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو
ہم کو سیراب کر دے گا"۔ ـــــــ "نہیں[۲۸]، بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔
یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ
کر ڈالے گا"۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ اُن کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔
اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں[۲۹]۔ اُن کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے[۳۰]

ملاحظہ ہو:۔

- ARABIA AND THE ISLES, HAROLD INGRAMS LONDON, 1946
- THE UNVEILING OF ARABIA, R.H. KIRNAN LONDON, 1937
- THE EMPTY QUARTER, PHILBY, LONDON, 1933

[۲۶] یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ تم پر عذاب کب آئے گا۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ تم پر کب عذاب نازل کیا جائے اور کب تک تمہیں مہلت دی جائے۔

[۲۷] یعنی تم اپنی نادانی سے میری اس تنبیہ کو مذاق سمجھ رہے ہو اور کھیل کے طور پر عذاب کا مطالبہ کیے جاتے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ خدا کا عذاب کیا چیز ہوتا ہے اور تمہاری حرکات کی وجہ سے وہ کس قدر تمہارے قریب آ چکا ہے۔

[۲۸] یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ اُن کو یہ جواب کس نے دیا۔ کلام کے انداز سے خود بخود یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ وہ جواب تھا جو اصل صورتِ حال نے عملاً ان کو دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ یہ بادل ہے جو ان کی وادیوں کو سیراب کرنے آیا ہے، اور حقیقت میں تھا وہ ہوا کا طوفان جو انہیں تباہ و برباد کرنے کے لیے بڑھا چلا آ رہا تھا۔

[۲۹] قومِ عاد کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۳ تا ۴۸، ۵۰، ۵۴ تا ۵۳

اُن کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل، سب کچھ دے رکھے تھے، مگر نہ وہ کان اُن کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے[۳۱]۔ اور اُسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے[۳۲]۔ ع ۱

۴۴۹۔ جلد سوم، ص ۷۴ تا ۲۷۹-۵۱۷ تا ۵۲۰۔۔۔ ۷۔ جلد چہارم تفسیر سورۃ حٰم السجدہ، رکوع ۲، حواشی ۲۰-۲۱۔

[۳۰] یعنی مال، دولت، طاقت، اقتدار، کسی چیز میں بھی تمہارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تمہارا دائرۂ اقتدار تو شہر مکہ کے حدود سے باہر کہیں بھی نہیں، اور وہ زمین کے ایک بڑے حصے پر چھائے ہوئے تھے۔

[۳۱] اس مختصر سے فقرے میں ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ خدا کی آیات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو حقیقت کا صحیح فہم و ادراک بخشتی ہیں۔ یہ فہم و ادراک انسان کو حاصل ہو تو وہ آنکھوں سے ٹھیک دیکھتا ہے، کانوں سے ٹھیک سنتا ہے، اور دل و دماغ سے ٹھیک سوچتا اور صحیح فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب وہ آیاتِ الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اُسے نگاہِ حق شناس نصیب نہیں ہوتی، کان رکھتے ہوئے بھی وہ ہر کلمۂ نصیحت کے لیے بہرا ہوتا ہے، اور دل و دماغ کی جو نعمتیں خدا نے اسے دی ہیں ان سے الٹی سوچ اور ایک سے ایک غلط نتیجہ اخذ کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ساری قوتیں خود اس کی اپنی ہی تباہی میں صرف ہونے لگتی ہیں۔

خلافت اور ملوکیت کا فرق

ابو الاعلیٰ مودودی

(۳)

بنی عباس | بنی امیہ کی حکومت سندھ سے لیکر اسپین تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں کمال درجہ دبدبے کی حکومت تھی اور بظاہر اس کی طاقت کو دیکھ کر گمان نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کسی کے ہلائے ہل سکے گی، لیکن جس طرز پر وہ چل رہی تھی اُس کی وجہ سے بس گردنیں ہی اس کے آگے جھکی ہوئی تھیں، دلوں میں اس کی کوئی جڑ نہ تھی۔ اسی لیے پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ عباسیوں نے نہایت آسانی سے اُن کا تختہ اُلٹ دیا، اور جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان پر رونے والی نہ تھی۔

عباسیوں کے وعدے | نئے مدعیانِ خلافت جس وجہ سے کامیاب ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے عام مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ ہم خاندانِ رسالت کے لوگ ہیں، ہم کتاب و سنت کے مطابق کام کریں گے اور ہمارے ہاتھوں سے حدود اللہ قائم ہونگی۔ ربیع الثانی ۱۳۲ھ میں جب سفاح کے ہاتھ پر کوفہ میں خلافت کی بیعت ہوئی تو اس نے اپنی پہلی تقریر میں بنی امیہ کی زیادتیاں بیان کرنے کے بعد کہا:

"میں یہ امید رکھتا ہوں کہ جس خاندان سے تم کو خیر ملی تھی اُس سے ظلم و ستم، اور جہاں سے تم کو صلاح ملی تھی وہاں سے فساد تم نہ پاؤ گے۔"

سفاح کے بعد اُٹھ کر اس کے چچا داؤد بن علی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ:

"ہم اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ اپنے لیے سیم و زر جمع کریں یا محلات بنوائیں اور ان میں نہریں کھود کر لائیں، بلکہ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے بنی عم (آلِ ابی طالب) پر ظلم کیا جا رہا تھا اور بنی امیہ تمہارے درمیان بُرے طریقوں پر چل رہے تھے۔ انہوں نے تم کو ذلیل و خوار کر رکھا تھا اور تمہارے بیت المال میں بے جا

تصرفات کر رہے تھے۔ اب ہم پر تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسول اور حضرت عباس کا ذمہ ہے کہ ہم تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سیرت کے مطابق حکومت کریں گے۔[61]

لیکن حکومت حاصل ہونے کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ یہ سب کچھ فریب تھا۔

ان کا عمل | بنی امیہ کے دارالسلطنت دمشق کو فتح کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتلِ عام کیا جس میں ۵۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۷۰ دن تک جامع بنی امیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی۔ حضرت معاویہؓ سمیت تمام بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت مل گئی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا، چند روز تک اسے منظرِ عام پر لٹکائے رکھا گیا اور پھر جلا کر اس کی راکھ اڑا دی گئی۔ بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ بصرے میں بنی امیہ کو قتل کر کے ان کی لاشیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچی گئیں اور انہیں سڑکوں پر ڈال دیا گیا جہاں کتے انہیں بھنبھوڑتے رہے۔ یہی کچھ مکے اور مدینہ میں بھی ان کے ساتھ کیا گیا۔[62]

سفاح کے خلاف موصل میں بغاوت ہوئی تو اس نے اپنے بھائی یحییٰ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ یحییٰ نے اعلان کیا کہ جو شہر کی جامع مسجد میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے امان ہے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے۔ پھر مسجد کے دروازوں پر پہرہ لگا کر ان امان یافتہ پناہ گزینوں کا قتلِ عام کیا گیا اور گیارہ ہزار آدمی مار ڈالے گئے۔ رات کو یحییٰ نے ان عورتوں کی آہ و بکا کا شور سنا جن کے مرد مارے گئے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ کل عورتوں اور بچوں کی باری ہے۔ اس طرح تین دن موصل میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا جس میں عورت، مرد، بچہ، بوڑھا، کوئی معاف نہ کیا گیا۔ یحییٰ کی فوج میں ۴ ہزار زنگی تھے۔ وہ موصل کی عورتوں پر ٹوٹ پڑے اور زنا بالجبر کا طوفان برپا کر دیا۔ ایک عورت نے یحییٰ کے گھوڑے کی لگام

[61] الطبری، ج ۶، ص ۸۲-۸۳۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۲۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۴۱۔

[62] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۳-۳۳۴-۳۴۱۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۴۵

پکڑ کر اسے شرم دلائی کہ "تم بنی ہاشم میں سے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچا کی اولاد ہو، تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے زنگی سپاہی عرب مسلمان عورتوں کی آبروریزی کرتے پھر رہے ہیں"۔ یحییٰ کو غیرت آگئی۔ اس نے اپنی فوج کے زنگی سپاہیوں کو تنخواہوں اور انعامات کا لالچ دے کر جمع کیا اور سب کو قتل کرادیا۔[۶۳]

یزید بن عمر بن ہُبیرہ کو سفاح نے اپنے ہاتھوں سے امان نامہ لکھ کر دیا اور پھر عہد و پیمان کی صریح خلاف ورزی کر کے اسے قتل کرادیا۔[۶۴]

خراسان کے مشہور فقیہ ابراہیم بن میمون الصائغ نے کتاب و سنت کے مطابق حدود اللہ قائم کرنے کے وعدوں پر بھروسہ کر کے عباسی دعوت کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کیا تھا اور انقلاب کی کامیابی تک وہ ابومسلم خراسانی کے دستِ راست بنے رہتے تھے۔ مگر کامیابی کے بعد جب انہوں نے ابومسلم سے حدود اللہ کے قیام کا مطالبہ کیا اور کتاب و سنت کے خلاف کام کرنے پر ٹوکا تو ابومسلم نے ان کو سزائے موت دی۔[۶۵]

منصور کے زمانہ میں عباسیوں کے اس دعوے کی قلعی بھی کھل گئی کہ وہ آل ابی طالب پر بنی امیّہ کے مظالم کا بدلہ لینے اٹھے تھے۔ جس زمانہ میں محمد بن عبداللہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم رُوپوش تھے اور منصور ان کی تلاش میں سرگرم تھا، اس نے ان کے پُورے خاندان اور ان کے رشتہ داروں کو صرف اس قصور میں گرفتار کر لیا کہ وہ اُن کا پتہ نہیں دے رہے تھے۔ ان کی ساری جائداد ضبط کر کے نیلام کی گئی۔ ان کو بیڑیوں اور طوق و زنجیر میں مقیّد کر کے مدینے سے عراق لے جایا گیا۔ جیل میں ان پر سخت مظالم کیے گئے۔ محمد بن ابراہیم بن الحسن کو دیوار میں زندہ چُنوا دیا گیا۔ ابراہیم بن عبداللہ کے خسر کو ننگا کر کے ڈیڑھ سو کوڑے لگائے گئے، پھر قتل کر کے ان کا سر خراسان میں گشت کرایا گیا اور چند آدمی اس کے ساتھ عوام

---

[۶۳] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۹-۳۴۰

[۶۴] الطبری، ج ۶، ص ۱۰۷ تا ۱۰۹- ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۸- البدایہ، ج ۱۰، ص ۵۴-۵۵

[۶۵] البدایہ، ج ۱۰، ص ۶۸-

کے سامنے یہ شہادت دیتے پھرے کہ یہ نفسِ زکیہ کا سر ہے[۶۶]۔ کچھ مدت بعد جب نفس زکیہ مدینہ میں شہید ہوئے تو ان کا سر کاٹ کر شہر شہر پھرایا گیا، اور ان کی اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں تین دن تک مدینہ میں برسرِ عام ٹنکائی گئیں، پھر کوہ سَلع کے قریب انہیں مقابر یہود میں پھینک دیا گیا[۶۷]۔

اِن واقعات نے ابتدا ہی میں یہ ظاہر کر دیا کہ بنی امیہ کی طرح بنی عباس کی سیاست بھی دین سے آزاد ہے، اور سیاسی اغراض کے لیے خدا کی قائم کی ہوئی حدوں کو پھاند جانے میں جس طرح انہیں باک نہ تھا، اِنہیں بھی نہیں ہے۔ اُن کے ہاتھوں جو انقلاب ہُوا اس سے صرف حکمران ہی بدلے، طرزِ حکومت نہ بدلا۔ اُنہوں نے اُموی دَور کی کسی ایک خرابی کو بھی دُور نہ کیا، بلکہ اُن تمام تغیرات کو جوں کا توں برقرار رکھا جو خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے آجانے سے اسلامی ریاست کے نظام میں رُونما ہوئے تھے۔

بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہُوا کہ بنی اُمیہ کے لیے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے تو عباسی خلفاء کے لیے ایران کے کسریٰ۔

شوریٰ کا نظام بھی اُسی طرح معطّل رہا اور اس سے وہی نتائج رونما ہوتے رہے جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

بیت المال کے معاملہ میں بھی ان کا طرزِ عمل اُمویوں سے مختلف نہ تھا۔ نہ اُس کی آمدنی کے معاملہ میں شریعت کے احکام و قواعد کی پابندی کی جاتی تھی نہ خرچ کے معاملہ میں۔ بیت المال اُمّت کا نہیں بادشاہ کا خزانہ تھا جس کی آمد و خرچ کے معاملہ میں کسی کو محاسبہ کا حق نہ تھا۔

عدلیہ پر خلیفہ اور اس کے قصر اور امراء اور متوسلین کا دباؤ بھی ویسا ہی رہا جیسا بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ خلیفہ المہدی کے زمانہ میں اُس کے ایک قائد اور ایک تاجر کا مقدمہ قاضی عبید اللہ بن حسن کی عدالت میں پیش ہُوا۔ خلیفہ نے قاضی صاحب کو لکھ بھیجا کہ اِس مقدمے کا فیصلہ میرے قائد کے حق میں کیا جائے۔

---

[۶۶] الطبری، ج ۶، ص ۱۶۱-۱۷۱ تا ۱۸۰۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۷۰ تا ۳۷۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۸۰-۸۲

[۶۷] البدایہ، ج ۱۰، ص ۹۰۔

قاضی صاحب نے اِس حکم کی اطاعت نہ کی اور معزول کر دیئے گئے[۶۸]۔ ہارون الرشید کے عہد میں قاضی حفص بن غیاث نے خلیفہ کی بیگم زبیدہ کے ایک آدمی کے خلاف فیصلہ کیا اور انہیں بھی عہدے سے ہٹنا پڑا[۶۹]۔

شعوبی تحریک اور زندقہ | نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں جو بنی امیہ نے بھڑکائی تھیں، بنی عباس کے عہد میں وہ پہلے سے بھی شدید تر ہو گئیں۔ اوّل تو عباسی دعوت کی بنیاد ہی ایک خاندان کے مقابلے میں دوسرے خاندان کے نسلی استحقاق پر تھی۔ مگر اپنی کامیابی کے لیے انہوں نے ایک طرف عرب قبائل کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانے، اور دوسری طرف عجمیوں کو عربوں کے خلاف بھڑکانے کا استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ عباسی دعوت کے امام، ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے ابو مسلم خراسانی کو خراسان کے کام کا سربراہ مقرر کرتے ہوئے جو ہدایات بھیجی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی کہ عربوں میں یمانی اور مُضری کے جو اختلافات موجود ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یمنیوں کو مُضریوں سے خوب لڑاؤ، اور دوسری ہدایت یہ تھی کہ اگر ممکن ہو تو ایک زبان بھی عربی بولنے والی باقی نہ چھوڑو اور پانچ بالشت یا اس سے زیادہ کا کوئی عرب لڑکا جس کے متعلق تمہیں ذرا بھی شبہ ہو، اسے قتل کر ڈالو[۷۰]۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ کے دَور میں اُن کے عربی تعصب کی وجہ سے عجمی قوم پرستی (شعوبیت) کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، بنی عباس کے زمانے میں وہ پوری قوت کے ساتھ بھڑک اٹھی، اور اس نے صرف عربی عصبیت ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود اسلام کے خلاف بھی زندقے کا ایک محاذ اٹھا کھڑا کیا۔

اہلِ عجم میں نسلی فخر و غرور کا جذبہ پہلے ہی موجود تھا۔ خصوصاً عربوں کو تو وہ اپنے مقابلے میں نہایت حقیر سمجھتے تھے۔ اسلامی فتوحات کے دَور میں جب وہ ریگستانِ عرب کے شتربانوں سے مغلوب ہوئے تو اوّل اوّل انہیں اپنی ذلّت کا سخت احساس ہوا۔ مگر اسلام کے اصولِ انصاف و مساوات، اور صحابہؓ

---

[۶۸] الخطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۰، ص ۳۰۹۔ مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۹۳۱

[۶۹] طاش کبری زادہ، مفتاح السعادہ، ج ۲، ص ۱۱۹۔ طبع اوّل، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۲۹ھ۔

[۷۰] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۲۹۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۲۸۔

تابعین اور علما و فقہاء امت کے دینداراانہ طرز عمل نے نہ صرف یہ کہ ان کے اس زخم پر مرہم رکھ دیا، بلکہ انہیں عالمگیر امتِ مسلمہ کے اندر کامل معاشرتی مساوات کے ساتھ جذب کرنا شروع کر دیا۔ اس کی پشت پر اگر حکومت کی انتظامی پالیسی بھی انہی اصولوں کے مطابق ہوتی تو کبھی کسی غیر عرب قوم کے اندر اپنی علیحدگی کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکتا۔ لیکن پہلے بنی امیہ کی سخت عربی عصبیت نے (جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں) ان کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کر کے ان میں جوابی تعصب پیدا کیا، اور پھر عباسیوں نے اسے اپنی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کر کے اسے اُبھرنے اور چھا جانے کا موقع دے دیا۔ اہل عجم نے اسی امید پر عباسی دعوت کا ساتھ دیا تھا کہ ہماری تلواروں کے بل پر جب نئی سلطنت قائم ہو گی تو اس پر ہم چھائے رہیں گے اور عربی اقتدار کا خاتمہ کر دیں گے۔ ان کی یہ توقع ٹھیک تھی اور وہ پوری ہوئی۔

الجاحظ کہتا ہے کہ دولتِ عباسیہ ایک خراسانی حکومت بن کر رہ گئی۔[۱] منصور کے زمانہ خلافت میں سپہ سالاری اور گورنری کے اکثر و بیشتر مناصب پر عجمی مقرر کیے گئے اور عربوں کی بالادستی ختم ہو کر رہ گئی۔[۲] الجہشیاری نے تاریخ الوزراء میں منصور کے عُمّال کی جو تفصیلات دی ہیں ان میں سب عجمی ہی عجمی نظر آتے ہیں۔[۳] ان عجمیوں نے سیاسی قوت حاصل کر کے شعوبیت کی تحریک زور شور سے اٹھائی جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے محض قوم پرستانہ تحریک ہی نہ تھی، بلکہ اپنے جِلَو میں زندقہ و الحاد اور اِباحیت کے جراثیم بھی ساتھ لے آئی تھی۔

اس شعوبی تحریک کا آغاز تو اس بحث سے ہوا تھا کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، لیکن بہت جلدی اس نے عربوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اور عرب کی مذمت میں، حتیٰ کہ قریش سمیت اُن میں سے ایک ایک قبیلے کی مذمت میں کتابیں لکھی جانے لگیں، جن کا تفصیلی ذکر

---

[۱] البیان والتبیین، ج ۳، ص ۱۸۱، مطبعۃ الفتوح الادبیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ۔

[۲] المسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۵۱۵، مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۹۵۸ء۔ المقریزی، کتاب السلوک ج ۱، ص ۱۵، دار الکتب المصریہ، ۱۹۳۴ء۔

[۳] مطبوعہ ویانا، ۱۹۲۶ء، صفحات ۱۳۹۔۱۵۳۔۱۵۵۔۱۵۷۔

ابن الندیم کی الفہرست میں ہمیں ملتا ہے۔ معتدل قسم کے شعوبی تو اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ مگر اس گروہ کے انتہا پسند لوگ عربوں سے گزر کر خود اسلام پر حملے کرنے لگے اور عجمی امراء، وزراء، کُتّاب (SECRETARIES) اور فوجی قائدین نے در پردہ اُن کی ہمت افزائی کی۔ الجاحظ کہتا ہے کہ "بہت سے لوگ، جن کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پائے جاتے ہیں، ان کے اندر یہ بیماری شعوبیت کی راہ سے آئی ہے۔ وہ اسلام سے اس لیے بیزار ہیں کہ عرب اس دین کو لائے تھے"[۵۸]۔ ان لوگوں نے مانی، زردشت اور مَزدَک کے مذاہب و عقائد کو زندہ کرنا شروع کیا۔ انہوں نے عجمی تہذیب اور نظامِ سیاست و ملک داری کے فضائل بیان کرنے شروع کیے۔ انہوں نے شعر و ادب کے پردے میں فسق و فجور اور اخلاقی بے قیدی کی تبلیغ شروع کی۔ دین اور اس کے حدود کا مذاق اڑایا۔ شراب و شاہد کی طرف دعوت دی۔ زُہد و تقویٰ پر پھبتیاں کسیں۔ آخرت اور جنت و دوزخ کی باتیں کرنے والوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ اور ان میں سے بعض نے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلائیں تاکہ مسلمانوں کا دین خراب کریں۔ چنانچہ ایک زندیق ابن ابی العَوجاء جب گرفتار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ میں نے چار ہزار ایسی حدیثیں گھڑی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا ہے، اور احکامِ اسلامی میں ردّ و بدل کر ڈالا ہے۔ منصور کے زمانہ میں کوفے کے گورنر محمد بن سلیمان بن علی نے اس کو موت کی سزا دی[۵۹]۔ ایک اور شخص یونس بن ابی فَرْوَہ نے اسلام اور عرب کی مذمت میں ایک کتاب لکھ کر قیصرِ روم کے دربار میں پیش کی اور اس پر انعام پایا[۶۰]۔ الجاحظ اپنے رسائل میں عجمی کاتبوں (حکومت کے سکرٹریوں) کی ایک کثیر تعداد کا حال یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کی ترتیب پر طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں تناقض ہے۔ احادیث کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی صحت میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔ صحابہ کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زبان رُکتی ہے۔ قاضی شُریح اور حسن بصری اور الشَّعبی کا ذکر آتا ہے

۵۸ کتاب الحیوان، ج ۷، ص ۶۸۔ المطبعۃ التقدم، مصر، ۱۹۰۶ء

۵۹ البدایہ، ج ۱۰، ص ۱۱۳۔

۶۰ امالی المرتضیٰ، ج ۱ ص ۹۰ - ۱۰۰۔ المطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۹۰۷ء

تو یہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ مگر اردشیر بابکان اور نوشیروان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سیاست اور ان کے تدبّر کی تعریف میں یہ رطب اللسان ہو جاتے ہیں[۷۷]۔ ابو العلاء المعرّی اس عہد کے بڑے بڑے نامور عجمیوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ سب زندیق تھے، مثلاً دِعبل، بَشّار بن بُرد، ابو نواس، ابو مسلم خراسانی وغیرہ[۷۸]۔ اور یہ زَندَقہ صرف اعتقادی گمراہیوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ عملاً اخلاقی حدود سے آزادی اُس کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح تھی۔ ابنِ عبد ربّہ کہتا ہے کہ عوام میں یہ بات معلوم و معروف تھی کہ شراب، زنا اور رشوت زندقے کے لوازم اور اس کی کھلی علامات ہیں[۷۹]۔

یہ فتنہ خلیفہ منصور عباسی کے عہد (۱۳۶ھ۔۱۵۸ھ / ۷۵۴ء۔۷۷۵ء) میں پوری طرح سر اٹھا چکا تھا۔ اس سے مسلمانوں میں صرف اعتقادی و اخلاقی فساد ہی پھیلنے کا خطرہ نہ تھا بلکہ سیاسی و اجتماعی حیثیت سے یہ مسلم معاشرے اور ریاست کو بھی پارہ پارہ کر دینے والا تھا۔ منصور کا جانشین المہدی اپنے خاندان کی سیاسی پالیسی کے یہ خوفناک نتائج دیکھ کر گھبرا اٹھا اور اس نے نہ صرف طاقت سے اِس تحریک کو مٹانے کی کوشش کی، بلکہ علماء کے ایک گروہ کو اس کام پر بھی مامور کیا کہ زنادقہ سے بحث کریں اور ان کے رد میں کتابیں لکھ کر اُن شکوک کو دماغوں سے نکالیں جو یہ لوگ اسلام کے خلاف عوام میں پھیلا رہے تھے[۸۰]۔ اس کی حکومت میں ایک مستقل محکمہ عمر الکلواذی کے تحت قائم کر دیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ زَندَقہ کا استیصال اور زنادِقہ کی سرکوبی کرے[۸۱]۔ اپنے بیٹے الہادی کو اس نے جو ہدایات دی تھیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندقے کے خطرات کس شدّت سے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا:

---

[۷۷] ثلاث رسائل للجاحظ، ص ۲۴، المطبعۃ السلفیہ، قاہرہ، ۱۳۴۴ھ۔

[۷۸] الغُفران، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۰ء

[۷۹] العِقد الفرید، ج ۲، ص ۱۷۹

[۸۰] المسعودی، ج ۲، ص ۴۱۵۔ المَقریزی، کتاب السلوک، ج ۱، ص ۱۵۔

[۸۱] الطبری، ج ۶، ص ۳۸۹ - ۳۹۱۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۱۴۹

"اگر یہ حکومت میرے بعد تیرے ہاتھ میں آئے تو مانی کے پیرووں کا استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا۔ یہ لوگ پہلے تو عوام کو ظاہری بھلائیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، مثلاً فواحش سے اجتناب، دنیا میں زہد اور آخرت کے لیے عمل۔ پھر انہیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ گوشت حرام ہے، پانی کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے (یعنی غسل نہ کرنا چاہیے) اور کسی قسم کے جانور کو ہلاک نہ کرنا چاہیے۔ پھر انہیں دو خداؤں کے اعتقاد کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور آخر کار بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح اور پیشاب سے غسل تک حلال کر دیتے ہیں، اور بچوں کو چراتے ہیں تاکہ انہیں ضلالت پر پرورش کریں۔[۵۲]"

المہدی کا یہ بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ میں عجمی زنادقہ بظاہر مسلمان بن کر باطن اپنے قدیم مذاہب کی تجدید کے لیے کوشاں تھے۔ المسعودی کے بیان کے مطابق یہ دعوت اُن تراجم کی بدولت پھیل رہی تھی جو منصور کے عہد میں پہلوی اور فارسی زبان سے ہوئے تھے، اور ابن ابی العوجاء، حماد عجرد، یحییٰ بن زیاد، مطیع بن ایاس جیسے لوگوں کی تصانیف اس زہر کو پھیلا رہی تھیں۔[۵۳]

خلاصۂ کلام یہ ہے مختصر رُوداد اُن تغیرات کی جو خلافتِ راشدہ کی جگہ ملوکیت کے آجانے سے رُونما ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُمت اور اس کی رائے کو نظر انداز کر کے کسی شخص، خاندان یا گروہ کا اپنے اقتدار کے لیے کوشاں ہونا اور زبردستی اسے قائم کرنا کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس غلطی کی ابتدا کرتے وقت چاہے اُسے یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس کا اقدام یہ نتائج پیدا کرے گا، اور اس کی نیت ہرگز یہ نہ ہو کہ یہ نتائج اس سے برآمد ہوں، لیکن بہرحال یہ اس کے فطری نتائج ہیں جو رُونما ہو کر رہتے ہیں۔

لیکن یہ خیال کرنا سخت غلط ہوگا کہ ان سیاسی تغیرات نے سرے سے اسلامی نظامِ زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ بعض لوگ بڑے سطحی انداز میں تاریخ کا مطالعہ کر کے بے تکلف یہ فیصلہ کر

۵۲؎ الطبری، ج ۶، ص ۴۳۳ - ۴۳۴

۵۳؎ مُروج الذہب، ج ۲، ص ۵۱۵۔

ڈالتے ہیں کہ اسلام تو بس تیس سال چلا اور پھر ختم ہو گیا۔ حالانکہ اصل صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ آگے کی چند سطور میں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کو جب اس سیاسی انقلاب سے سابقہ پیش آیا تو اس کے اجتماعی شعور نے کس طرح اپنے نظامِ زندگی کو سنبھالنے کے لیے ایک دوسری صورت اختیار کر لی۔

قیادت کی تقسیم اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل نیابت تھی۔ خلیفہ راشد محض راشد دراست رو، ہی نہ ہوتا تھا بلکہ مرشد دراہ نما، بھی ہوتا تھا۔ اُس کا کام محض مملکت کا نظم ونسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہ تھا بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا۔ اُس کی ذات میں ایک ہی مرکزی قیادت تھی جو سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی سربراہی بھی کرتی تھی اور عقیدہ ومذہب، اخلاق وروحانیت، تہذیب وتمدن، تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے تمام معاملات میں اُن کی امامت ورہبری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ جس طرح اسلام ہر پہلو کا جامع ہے اسی طرح یہ قیادت بھی ہر پہلو کی جامع تھی اور مسلمان پورے اعتماد کے ساتھ اپنی اجتماعی زندگی اس کی رہنمائی میں بسر کر رہے تھے۔

اس خلافت کی جگہ جب ملوکیت آئی تو نہ وہ اِس جامع قیادت کی اہل تھی، نہ مسلمان ایک دن کے لیے بھی اُس کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار ہوتے۔ بادشاہوں کے جو کارنامے ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں، ان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کا کوئی اخلاقی وقار قوم میں قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ گردنیں زبردستی جھکا سکتے تھے اور وہ انہوں نے جھکا لیں۔ وہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو خوف وطمع کے ہتھیاروں سے اپنی اغراض کا خادم بھی بنا سکتے تھے اور انہوں نے بنا لیا۔ مگر وہ دل نہیں جیت سکتے تھے کہ لوگ ان کو اپنے دین کا امام بھی مان لیتے۔

یہ نئی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی:

ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا، اور

چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جا سکتا تھا، نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی، اس لیے امت نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔ صرف ان کی سیاست دین کی تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے امت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ اُن کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے، امن و امان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے، اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے، اور عدالتوں کے ذریعہ سے اسلامی قوانین کا اجراء برقرار رہے۔ اِن مقاصد کے لیے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ انہی بادشاہوں کو امام برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ و مرشدہ مانتے تھے، بلکہ وہ صرف اس معنی میں تھی کہ وہ اس امرِ واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں۔

دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایائے صحابہ، تابعین و تبع تابعین، فقہاء و محدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کر لی۔ یہ قیادت اگرچہ منظّم نہ تھی۔ اگرچہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا جسے سب نے اپنا مرشد مان لیا ہو۔ اگرچہ اس کی کوئی با اختیار کونسل نہ تھی کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں ان کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کر دے اور وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے۔ یہ سب لوگ اپنی انفرادی حیثیت میں الگ الگ کام کر رہے تھے، اور ان متفرق افراد کے پاس اخلاقی اثر و وقار کے سوا کوئی طاقت نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ سب ایک ہی چشمۂ ہدایت ــ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ــ سے فیض یاب تھے، اور نیک نیتی کے ساتھ دینی رہنمائی کر رہے تھے، اس لیے جزئیات میں مختلف الرائے ہونے کے باوجود مجموعی طور پر

ان کا مزاج ایک ہی تھا، اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پراگندہ ہونے کے باوجود ان کا پورا گروہ مسلمانوں کو ایک ہی فکری و اخلاقی قیادت فراہم کر رہا تھا۔

اِن دونوں قسم کی قیادتوں میں تعاون کم اور تصادم یا کم از کم عدم تعاون زیادہ رہا۔ سیاسی قیادت نے دینی قیادت کو اُس کے فرائض انجام دینے میں بہت کم مدد دی، اور جتنی مدد وہ دے سکتی تھی، دینی قیادت نے اس سے بھی کم اسے قبول کیا، کیونکہ اس مدد کے بدلے میں جو قیمت اسے سیاسی قیادت کو ادا کرنی پڑتی اسے ادا کرنے کے لیے اُس کا ایمان و ضمیر تیار نہ تھا۔ پھر خود اُمّت کا حال بھی یہ تھا کہ دینی قیادت کے لوگوں میں سے جو بھی سلاطین کے قریب گیا، اور جس نے بھی کوئی منصب یا وظیفہ اُن سے قبول کر لیا، وہ مشکل ہی سے قوم میں اپنا اعتماد برقرار رکھ سکا۔ سلاطین سے بے نیازی، اور ان کے قہر و غضب کے مقابلے میں ثابت قدمی مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کی اہلیت کا معیار بن گئی تھی۔ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی اللہ کا بندہ چلا تو قوم بڑی کڑی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی، اور اس کی بزرگی کو اس نے صرف اُس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جا کر بھی اُس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔ عام مسلمان تو درکنار، خود وہ لوگ بھی جو سیاسی قیادت کے ہاتھ بِک چکے تھے، اِس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ دین کا امام و پیشوا کسی ایسے شخص کو مان لیں جو اُنہی کی طرح بِک جانے والا ہو، یا طاقت سے دب کر احکام دین میں تحریف کرنے لگے۔

اِس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔* علمائے اُمّت نے تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم دینیہ کی

---

* اس مقام پر تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ بات سمجھ لینا مفید ہوگا کہ تیسری صدی ہجری میں جب عباسی خلافت پر زوال آنا شروع ہوا تو دینی قیادت تو بدستور علماء و فقہاء اور اخیارِ اُمّت کے ہاتھ میں رہی، مگر سیاسی قیادت

تدوین، اور درس و افتاء کا جتنا کام کیا، حکومت سے آزاد رہ کر، اس کی مدد کے بغیر، بلکہ بارہا اس کی مزاحمت کے باوجود اور اس کی بے جا مداخلتوں کا سخت مقابلہ کرتے ہوئے کیا۔ صلحاء امت نے مسلمانوں کے ذہن اور ان کے اخلاق و کردار کی تربیت و تہذیب کے لیے جو کام کیا وہ بھی سیاسی قیادت سے پوری طرح غیر متاثر رہا۔ اور اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر انہی بزرگوں کی بدولت ہوئی۔ سلاطین نے زیادہ تر صرف یہ خدمت انجام دی کہ ممالک فتح کر کے کروڑوں انسانوں کو اسلام کے دائرۂ اثر میں لے آتے۔ اس کے بعد ان کروڑوں انسانوں کا دائرۂ ایمان میں داخل ہو جانا بادشاہوں کی سیاست کا نہیں بلکہ صالحینِ امت کے پاکیزہ کردار کا کرشمہ تھا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہو کر دینی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ نہایت قابلِ قدر ہیں۔ آج یہ انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اسلام زندہ ہے اور امتِ مسلمہ اپنے دین کو اس کے صحیح خد و خال میں دیکھ رہی ہے۔ مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافتِ راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی، جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے، بلکہ اس اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ یہ صورتِ حال اگر ڈیڑھ دو صدی بھی باقی رہ گئی ہوتی تو شاید دنیا میں کفر باقی نہ رہتا، یا اگر رہ بھی جاتا تو کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔

۲۔ دو حصوں میں بٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ آخر کار عملاً اس قیادت کے مالک وہ امراء اور سلاطین بن گئے جن کے ہاتھ میں بالفعل حکومت کی باگیں آ گئی تھیں، اور عباسی خلفاء صرف سیاسی سجادہ نشین بن کر رہ گئے جنہیں نہ دینی قیادت حاصل تھی، نہ سیاسی قیادت۔ صرف ایک نمائشی مذہبی تقدس تھا جو "خلافت" کے نام کی وجہ سے ان کو حاصل تھا۔ اسی کی بنا پر وہ سلاطین کی دستار بندی کرتے تھے اور سلاطین ان کا خطبہ و سکہ چلاتے تھے۔

رسائل و مسائل

سوالات و اعتراضات بسلسلۂ بحث خلافت

(۲)

اب میں ان اصل مسائل کی طرف آتا ہوں جو اس سلسلۂ مضامین میں زیر بحث آئے ہیں۔

اقربا کے معاملہ میں حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کی تشریح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقربا کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا اس کے متعلق میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ شبہ نہیں آیا کہ معاذاللہ وہ کسی بدنیتی پر مبنی تھا۔ ایمان لانے کے وقت سے ان کی شہادت تک ان کی پوری زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین اور محبوب ترین صحابیوں میں سے تھے۔ دینِ حق کے لیے اُن کی قربانیاں، ان کے نہایت پاکیزہ اخلاق، اور ان کے تقویٰ و طہارت کو دیکھ کر آخر کون صاحبِ عقل آدمی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس سیرت و کردار کا انسان بدنیتی کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں خویش نوازی (NEPOTISM) کہا جاتا ہے۔ دراصل ان کے اس طرزِ عمل کی بنیاد وہی تھی جو انہوں نے خود بیان فرمائی ہے کہ وہ اسے صلہ رحمی کا تقاضا سمجھتے تھے[1]۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ قرآن و سنت میں جس صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے اس کا تقاضا اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جو بھلائی کرنا بھی آدمی کے اختیار میں ہو وہ اس سے دریغ نہ کرے۔ یہ نیت کی غلطی نہیں بلکہ رائے کی غلطی، یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی۔ نیت کی غلطی وہ اُس وقت ہوتی جبکہ وہ اُس کام کو ناجائز جانتے اور پھر محض اپنے مفاد یا اپنے اقرباء کے مفاد کے لیے اس کا ارتکاب کرتے۔ لیکن اسے اجتہادی غلطی کہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے، کیونکہ صلۂ رحمی کے

[1] کنز العمال ج ۵، حدیث نمبر ۲۳۲۴۔ طبقات ابن سعد جلد ۳، ص ۶۴

حکم کا تعلق اُن کی ذات سے تھا نہ کہ اُن کے منصبِ خلافت سے۔ انہوں نے زندگی بھر اپنی ذات سے اپنے اقربا کے ساتھ جو فیاضانہ حسنِ سلوک کیا وہ بلاشبہ صلۂ رحمی کا بہترین نمونہ تھا۔ انہوں نے اپنی تمام جائداد اور ساری دولت اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردی اور خود اپنی اولاد کو ان کے برابر رکھا۔ اِس کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے، مگر صلۂ رحمی کا کوئی حکم خلافت کے عہدے سے تعلق نہ رکھتا تھا کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے بھی اپنے اقربا کو فائدہ پہنچانا اِس حکم کا صحیح تقاضا ہوتا۔

صلۂ رحمی کے شرعی احکام کی تاویل کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ اپنے اقربا کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے کسی جُز کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ خلیفہ کسی ایسے شخص کو کوئی عہدہ نہ دے جو اُس کے خاندان یا برادری سے تعلق رکھتا ہو، نہ خُمس کی تقسیم یا بیت المال سے امداد دینے کے معاملہ میں کوئی ایسا ضابطۂ شرعی موجود تھا جس کی انہوں نے کوئی خلاف ورزی کی ہو۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر کی جس وصیت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی کوئی شریعت نہ تھی جس کی پابندی حضرت عثمان پر لازم اور خلاف ورزی ناجائز ہوتی۔ اس لیے اُن پر یہ الزام ہرگز نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں حدِ جواز سے کوئی تجاوز کیا تھا۔ لیکن کیا اس کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ تدبیر کے لحاظ سے صحیح ترین پالیسی وہی تھی جو حضرت ابوبکر و عمر نے اپنے اقربا کے معاملہ میں اختیار فرمائی اور جس کی وصیت حضرت عمرؓ نے اپنے تمام امکانی جانشینوں کو کی تھی؟ اور کیا اس بات کو ماننے میں بھی تامل کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے ہٹ کر جو پالیسی اختیار کی وہ بلحاظ تدبیر نامناسب بھی تھی اور عملاً سخت نقصان دہ بھی ثابت ہوئی؟ بلاشبہ حضرت والا کو اُن نقصانات کا اندازہ نہیں تھا جو بعد میں اُس سے ہوئے، اور یہ تو کوئی احمق ہی خیال کر سکتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اس ارادے سے کیا کہ یہ نتائج اُس سے برآمد ہوں۔ لیکن تدبیر کی غلطی کو بہر حال غلطی ماننا پڑے گا۔ کسی تاویل سے بھی اس بات کو صحیح نہیں ٹھیرایا جا سکتا کہ ریاست کا سربراہ اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کو حکومت کا چیف سکرٹری بنا دے، اور

جزیرۃ العرب سے باہر کے تمام اسلامی مقبوضات پر اپنے ہی خاندان کے گورنر مقرر کر دیے۔ (یہ واضح رہے کہ اُس زمانے کے نظم ونسق کی رُو سے افریقیہ کے تمام مفتوحہ علاقے مصر کے گورنر کے ماتحت، شام کا پورا صوبہ دمشق کے گورنر کے ماتحت اور عراق، آذربائیجان، ارمینیہ، اور خراسان وفارس کے تمام علاقے کوفہ وبصرہ کے گورنروں کے ماتحت تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ ان تمام صوبوں کے گورنر انہی کے رشتہ دار تھے۔ یہ ناقابلِ انکار تاریخی واقعات ہیں جنہیں واقعہ کی حد تک موافق ومخالف سب نے مانا ہے اور کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ واقعۃً ایسا نہیں ہوا تھا)

اِس تدبیر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سے بزرگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو حضرت عثمانؓ نے عہدے دیئے تھے ان میں سے اکثر حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی عہدے پا چکے تھے۔ مگر یہ بڑا کمزور استدلال ہے۔ اوّل تو حضرت عمرؓ نے اپنے رشتے داروں کو عہدے نہیں دیئے تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو دیئے تھے جن میں حضرت عثمان کے رشتہ دار بھی شامل تھے۔ یہ چیز کسی کے لیے بھی دل کی جلن کی موجب نہ ہوسکتی تھی۔ دل کی جلن لوگوں کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب سربراہ مملکت خود اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دینے لگے۔ دوسرے، حضرت عمرؓ کے زمانے میں اِن لوگوں کو اتنے بڑے عہدے کبھی نہیں دیئے گئے تھے جو بعد میں ان کو دے دیئے گئے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اُن کے زمانہ میں مصر کے صرف ایک فوجی افسر تھے۔ حضرت معاویہؓ صرف دمشق کے علاقے کے گورنر تھے۔ ولید بن عُقبہ صرف الجزیرہ کے عرب علاقے پر حاکم بنائے گئے تھے۔ سعید بن العاص اور عبداللہ بن عامر بھی چھوٹے چھوٹے عہدوں پر رہے تھے۔ یہ صورت ان کے زمانے میں کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ جزیرۃ العرب سے باہر کے تمام اسلامی مقبوضات ایک ہی برادری کے گورنروں کے ماتحت ہوں اور وہ برادری بھی خلیفہ وقت کی اپنی برادری ہو۔

یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہ سب لوگ جن کو حضرت عثمان کے آخری عہد میں اتنی بڑی اہمیت حاصل ہوئی، طُلَقاءؔ[1] میں سے تھے اور اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و

[1] طُلَقاء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی دیدی تھی۔

تربیت سے فائدہ اٹھانے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور کی بھی یہ پالیسی نہ تھی اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی اس پر عامل نہیں ہوئے کہ اِن لوگوں کا مقاطعہ کیا جائے، یا انہیں اسلامی ریاست میں کام کرنے کے ہر موقع سے الگ رکھا جائے۔ حضورؐ نے اور آپ کے بعد شیخین نے ان کی تالیفِ قلب اور ان کی تربیت کرکے ان کو معاشرے میں اچھی طرح جذب کرنے کی کوشش فرمائی تھی اور ان سے ان کی استعداد کے مطابق کام بھی آپ اور دونوں خلفاء لیتے رہے۔ مگر یہ پالیسی نہ حضور کی تھی اور نہ شیخین کی کہ سابقین اولین کے بجائے اب ان لوگوں کو آگے بڑھایا جائے اور مسلم معاشرے اور ریاست کی رہنمائی و کارفرمائی کے مقام پر یہ فائز ہوں۔ بعد کے واقعات نے جبکہ بنی امیہ کے ہاتھ میں پورا اقتدار آیا، یہ بات عملاً ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ چاہے غیر دینی سیاست کے ماہر اور انتظامی اور فوجی لحاظ سے بہترین قابلیتوں کے مالک ہوں، لیکن امتِ مسلمہ کی اخلاقی قیادت اور دینی سربراہی کے لیے موزوں نہ تھے۔ یہ حقیقت تاریخ میں اتنی نمایاں ہے کہ کوئی وکالت صفائی اس پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

حضرت معاویہ کو مسلسل ۱۶-۱۷ سال ایک ہی صوبے پر گورنر رکھنا بھی شرعاً ناجائز نہ تھا، مگر سیاسی تدبیر کے لحاظ سے نامناسب ضرور تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ کسی قصور کے بغیر ان کو معزول ہی کر دیا جاتا۔ صرف یہ بات کافی تھی کہ ہر چند سال کے بعد ان کا تبادلہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی گورنری پر کیا جاتا رہتا۔ اس صورت میں وہ کسی ایک صوبے میں بھی اتنے طاقت ور نہ ہو سکتے تھے کہ کسی وقت مرکز کے مقابلے میں تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہونا اُن کے لیے ممکن ہوتا۔

بیت المال سے اقربا کی مدد کا معاملہ | بیت المال سے اپنے اقربا کی مدد کے معاملہ میں حضرت عثمان نے جو کچھ کیا اس پر بھی شرعی حیثیت سے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ معاذ اللہ، انہوں نے خدا اور مسلمانوں کے مال میں کوئی خیانت نہیں کی تھی۔ لیکن اس معاملہ میں بھی ان کا طریق کار بلحاظ تدبیر ایسا تھا جو دوسروں کے لیے وجہِ شکایت بنے بغیر نہ رہ سکا۔

محمد بن سعد نے طبقات میں امام زُہری کا یہ قول نقل کیا ہے:

واستعمل اقرباءہ واھل بیتہ فی الست الاواخر، وکتب لمروان بخمس مصر، واعطیٰ اقرباءہ المال وتاول فی ذالک الصلۃ التی امر اللہ بھا، واخذ الاموال واستسلف من بیت المال وقال ان ابا بکر وعمر ترکا من ذالک ما ھو لھما وانی اخذتہ فقسمتہ فی اقربائی فانکر الناس علیہ

(طبقات ابن سعد، ج ۳ص ۶۴)

حضرت عثمان نے اپنی حکومت کے آخری ۶ سالوں میں اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو حکومت کے عہدے دیئے، اور مروان کے لیے مصر کا خمس (یعنی افریقہ کے اموالِ غنیمت کا خمس جو مصر کے صوبے کی طرف سے آیا تھا) لکھ دیا اور اپنے رشتہ داروں کو مالی عطیے دیئے، اور اس معاملہ میں یہ تاویل کی کہ یہ وہ صلہ رحمی ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ انہوں نے بیت المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں، اور کہا کہ ابوبکر و عمر نے اس مال میں سے اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور میں نے اسے لے کر اپنے اقربا میں تقسیم کیا ہے۔ اسی چیز کو لوگوں نے ناپسند کیا۔

یہ امام زُہری کا بیان ہے جن کا زمانہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے قریب ترین تھا، اور محمد بن سعد کا زمانہ امام زُہری کے زمانے سے بہت قریب ہے۔ ابنِ سعد نے صرف دو واسطوں سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔ اگر یہ بات ابنِ سعد نے امام زہری کی طرف، یا امام زہری نے حضرت عثمان کی طرف غلط منسوب کی ہوتی تو محدثین اس پر ضرور اعتراض کرتے۔ اس لیے اس بیان کو صحیح ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کی تائید ابنِ جریر طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ افریقہ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح نے وہاں کے بَطریق سے ۳۰۰ قنطار سونے پر مصالحت کی تھی فامر بھا عثمان لآل الحکم (پھر حضرت عثمانؓ نے یہ رقم الحکم، یعنی مروان بن حکم کے باپ کے خاندان کو عطا کر دینے کا حکم دیا)[1]۔ حضرت عثمانؓ نے خود بھی ایک موقع پر ایک مجلس میں، جہاں حضرت علیؓ،

---

[1] الطبری، ج ۳، ص ۳۱۴۔

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت معاویہ موجود تھے، اور ان کے عطایا پر اعتراضات زیر بحث تھے، اپنے طرزِ عمل کی یہ تشریح فرمائی تھی:

"میرے دونوں پیش رو اپنی ذات اور اپنے رشتہ داروں کے معاملے میں سختی برتتے رہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رشتے داروں کو مال دیا کرتے تھے۔ میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جس کے لوگ قلیل المعاش ہیں۔ اس وجہ سے میں نے اُس خدمت کے بدلے میں جو میں اس حکومت کی کر رہا ہوں، اِس مال میں سے روپیہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنے کا حق ہے۔ اگر آپ لوگ اِسے غلط سمجھتے ہیں تو اس روپے کو واپس کرنے کا فیصلہ کر دیجیے، میں آپ کی بات مان لونگا۔ سب لوگوں نے کہا آپ نے یہ بات بہت ٹھیک فرمائی۔ پھر حاضرین نے کہا آپ نے عبداللہ بن خالد بن اسید اور مروان کو روپیہ دیا ہے۔ ان کا بیان تھا کہ یہ رقم مروان کو ۱۵ ہزار کی اور ابن اسید کو ۵۰ ہزار کی مقدار میں دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ رقم ان دونوں سے بیت المال کو واپس دلوائی گئی اور لوگ راضی ہو کر مجلس سے اٹھے۔"[۲]

اِن روایات سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقربا کو روپیہ دینے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ ہرگز شرعی جواز کی حد سے متجاوز نہ تھا۔ انہوں نے جو کچھ لیا وہ یا تو صدرِ مملکت کی حیثیت سے اپنے حق الخدمت کے طور پر لے کر خود استعمال کرنے کے بجائے اپنے عزیزوں کو دیا، یا بیت المال سے قرض لے کر دیا جسے وہ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے، یا اپنی صوابدید کے مطابق انہوں نے خمس کے مال کو تقسیم کیا جس کے لیے کوئی مفصل شرعی ضابطہ موجود نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر حضرت ابوبکر و عمر کی طرح وہ اپنے رشتہ داروں کے سوا دوسرے لوگوں کے ساتھ اس نوعیت کی فیاضی برتتے تو کسی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر خلیفۂ وقت کا خود اپنے رشتہ داروں کے معاملہ میں یہ فیاضی برتنا موضوعِ تہمت بن گیا۔ حضرت ابوبکر و عمر نے اسی بنا پر اپنے آپ کو ہر شک و شبہ سے

[۲] الطبری، ج ۳، ص ۲۹۲۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۷۹

بالاتر رکھنے کی خاطر اپنی ذات پر بھی سختی کی تھی اور اپنے عزیزوں کو بھی اُن فیاضیوں سے محروم رکھا تھا جو وہ دوسرے سب لوگوں کے ساتھ برتتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ احتیاط ملحوظ نہ رکھی اور وہ اعتراضات کے ہدف بن گئے۔

شورش کے اسباب حضرت عثمان کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، یا وہ محض اہلِ عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی، تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ اگر لوگوں میں ناراضی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضی فی الواقع موجود نہ ہوتی تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرتے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو اس کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کو اپنی شرارت میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقربا کے معاملہ میں حضرت عثمان نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا اس پر عام لوگوں ہی میں نہیں بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضی پائی جاتی تھی۔ اسی سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور جو کمزور عناصر انہیں مل گئے ان کو اپنی سازش کا شکار بنا لیا۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ فتنہ اٹھانے والوں کو اسی رخنے سے اپنی شرارت کے لیے راستہ ملا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ:

وکان الناس ینقمون علی عثمان تقریبه مروان وطاعته له ویرون ان کثیرًا مما ینسب الی عثمان لم یامر به وان ذالك عن رأی مروان دون عثمان فکان الناس قد شنفوا لعثمان لما کان یصنع بمروان ویقربه۔

(طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۶)

لوگ حضرت عثمان سے اس لیے ناراض تھے کہ انہوں نے مروان کو مقرب بنا رکھا تھا اور وہ اس کا کہا مانتے تھے۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ بہت سے کام جو حضرت عثمان کی طرف منسوب ہوتے ہیں ان کا حضرت عثمان نے خود کبھی حکم نہیں دیا بلکہ مروان ان سے پوچھے بغیر اپنے طور پر وہ کام کر ڈالتا ہے اسی وجہ سے لوگ مروان کو مقرب بنانے اور اس کو یہ مرتبہ دینے پر معترض تھے۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ کوفہ سے جو وفد حضرت عثمان کے پاس شکایات پیش کرنے کے لیے آیا

تھا اس نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ جس چیز پر اعتراض کیا وہ یہ تھی:

لبعثوا الی عثمان من یناظرہ فیما فعل وفیما اعتمد من عزل کثیر من الصحابة وتولیة جماعة من بنی امیة من اقربائه واغلظوا له فی القول وطلبوا منه ان یعزل عماله ویستبدل ائمة غیرهم (البدایه والنهایه ج ۷، ص ۱۶۷)

اہلِ کوفہ نے کچھ لوگوں کو حضرت عثمان سے اس امر پر بحث کرنے کے لیے بھیجا کہ انہوں نے بہت سے صحابہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ بنی امیہ میں سے اپنے رشتہ داروں کو گورنر مقرر کیا ہے۔ اس پر ان لوگوں نے حضرت عثمان سے بڑی سخت کلامی کی اور مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو معزول کر کے دوسروں کو مقرر کریں۔

آگے چل کر حافظ ابن کثیر پھر لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کے لیے سب سے بڑا ہتھیار جو ان کے مخالفین کے پاس تھا وہ یہی تھا کہ:

ما ینقمون علیه من تولیته اقرباءه وذوی رحمه وعزله کبار الصحابة فدخل هذا فی قلوب کثیر من الناس۔ (البدایه، ج ۷، ص ۱۶۸)

حضرت عثمان نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے رشتہ داروں کو جو گورنر بنایا تھا اس پر وہ اظہارِ ناراضی کرتے تھے اور یہ بات بکثرت لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتی تھی۔

طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر نے وہ مفصل گفتگوئیں نقل کی ہیں جو اس فتنے کے زمانے میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے درمیان ہوئی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ مدینے میں جب حضرت عثمانؓ پر ہر طرف نکتہ چینیاں ہونے لگیں، اور حالت یہ ہو گئی کہ چند صحابہ (زید بن ثابت، ابو اسید الساعدی، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم) کے سوا شہر میں کوئی صحابی ایسا نہ رہا جو حضرتِ والا کی حمایت میں زبان کھولتا، تو لوگوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ حضرت عثمانؓ سے مل کر ان معاملات پر بات کریں۔ چنانچہ وہ ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کو وہ پالیسی بدل دینے کا مشورہ دیا جس پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے

عہدے دیئے ہیں انہیں آخر عمر بن الخطاب نے بھی تو عہدوں پر مامور کیا تھا، پھر میرے ہی اوپر لوگ کیوں معترض ہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا "عمرؓ جس کو کسی جگہ کا حاکم مقرر کرتے تھے، اس کے متعلق اگر انہیں کوئی قابلِ اعتراض بات پہنچ جاتی تھی تو وہ بُری طرح اس کی خبر لے ڈالتے تھے، مگر آپ ایسا نہیں کرتے۔ آپ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "وہ آپ کے بھی تو رشتہ دار ہیں"۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا ان رحمهم منی لقریبة ولکن الفضل فی غیرھم۔ "بے شک میرا بھی ان سے قریبی رشتہ ہے، مگر دوسرے لوگ ان سے افضل ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "کیا عمرؓ نے معاویہ کو گورنر نہیں بنایا تھا؟" حضرت علیؓ نے جواب دیا "عمرؓ کا غلام یرفا بھی ان سے اتنا نہ ڈرتا تھا جتنے معاویہ ان سے ڈرتے تھے، اور اب یہ حال ہے کہ معاویہ آپ سے پوچھے بغیر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ عثمان کا حکم ہے مگر آپ انہیں کچھ نہیں کہتے"۔[1]

ایک اور موقع پر حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور اپنی قرابت کا واسطہ دے کر ان سے کہا کہ آپ اِس فتنے کو فرو کرنے میں میری مدد کریں۔ انہوں نے جواب دیا "یہ سب کچھ مروان بن الحکم، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر اور معاویہ کی بدولت ہو رہا ہے۔ آپ ان لوگوں کی بات مانتے ہیں اور میری نہیں مانتے"۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "اچھا اب میں تمہاری بات مانوں گا"۔ اس پر حضرت علیؓ انصار و مہاجرین کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر مصر سے آنے والے شورشیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو واپس جانے کے لیے راضی کیا[2]۔ اسی زمانۂ فتنہ میں ایک اور موقع پر حضرت علیؓ سخت شکایت کرتے ہیں کہ میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مروان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے۔ آپ خود منبرِ رسول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اٹھتی ہے[3]۔

[1] الطبری، ج ۳، ص ۳۷۷۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۷۶۔ البدایہ، ج ۷، ص ۱۶۸-۱۶۹

[2] الطبری، ج ۳، ص ۳۹۴۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۸۱-۸۲۔

[3] الطبری، ج ۳، ص ۳۹۸۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۸۳-۸۴

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور حضرت عائشہ کے متعلق بھی ابن جریر نے روایات نقل کی ہیں کہ یہ حضرات بھی اس صورتِ حال سے ناراض تھے[1]۔ مگر ان میں سے کوئی بھی یہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ خلیفہ وقت کے خلاف کوئی شورش یا بغاوت ہو یا ان کے قتل تک نوبت پہنچ جائے۔ طبری نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ انما اردنا ان یستعتب امیر المومنین عثمان ولم نرد قتلہ فغلب سفہاء الناس الحلماء حتی قتلوہ۔ "ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ امیر المومنین عثمانؓ کو یہ پالیسی ترک کر دینے پر آمادہ کیا جائے۔ ہمارا یہ ہرگز خیال نہ تھا کہ وہ قتل کر ڈالے جائیں۔ مگر بے وقوف لوگ بردبار لوگوں پر غالب آگئے اور انہوں نے ان کو قتل کر دیا۔"

حضرت علیؓ کی خلافت | حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جن حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے دو ہزار شورشی دار الخلافہ پر مسلط تھے۔ خلیفہ وقت کو قتل تک کر گزرے تھے۔ خود دار الخلافہ میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہم خیال موجود تھی۔ نئے خلیفہ کے انتخاب میں وہ لوگ یقیناً شریک ہوئے، اور ایسی روایات بھی بلاشبہ موجود ہیں کہ جب حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو ان لوگوں نے بعض حضرات کو زبردستی بھی بیعت پر مجبور کیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ انتخاب غلط تھا؟ کیا اُس وقت حضرت علیؓ سے بہتر کوئی آدمی مدینہ ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں ایسا موجود تھا جسے خلیفہ منتخب ہونا چاہیے تھا؟ کیا اُس وقت کے رائج اور مسلّم اسلامی دستور کی رُو سے حضرت علیؓ جائز طور پر خلیفہ منتخب نہ ہو گئے تھے؟ کیا اسلامی دستور میں ایسی کوئی چیز کہیں پائی جاتی ہے کہ نئے خلیفہ کے انتخاب میں اگر سابق خلیفہ کے خلاف شورش برپا کرنے والا گروہ بھی شریک ہو گیا ہو تو اس کا انتخاب غیر قانونی قرار پائے؟ کیا یہ درست تھا اور یہی ہونا چاہیے تھا کہ ایک خلیفہ شہید ہو چکا ہو اور دوسرا خلیفہ اس کی جگہ جلدی سے جلدی منتخب نہ کر لیا جائے بلکہ دنیائے اسلام ایک مدت تک بے خلیفہ ہی پڑی رہے؟ اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی دانستہ ہی قاتلین عثمان کو گرفتار کرنے

---

[1] الطبری، ج ۳ ص ۷۷ ۴ - ۴۸۶

اور ان پر مقدمہ چلانے میں کوتاہی کر رہے تھے یا ان کے ہاتھ میں بے بس تھے تب بھی کیا اسلامی آئین و دستور کی رُو سے یہ بات ان کی خلافت کو ناجائز، اور ان کے خلاف تلوار لے کر کھڑے ہو جانے کو جائز کر دینے کے لیے کافی تھی؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو بعد کے واقعات کے بارے میں ایک صحیح رائے قائم کرنے کے لیے فیصلہ کُن اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان سوالات کا جواب اثبات میں دینا چاہتا ہو تو وہ ضرور اپنی دلیل پیش کرے۔ لیکن پہلی صدی سے لیکر آج تک تمام اہلِ سنت بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفۂ راشد تسلیم کرتے رہے ہیں اور ہمارے اپنے ملک میں ہر جمعہ کو اہلِ سنت بالالتزام ان کی خلافت کا اعلان کر رہے ہیں۔ کم و بیش یہی صورتِ حال خود حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی تھی کہ ایک شام کے صوبے کو چھوڑ کر جزیرۃ العرب اور اس کے باہر کے تمام اسلامی مقبوضات اُن کی خلافت مان رہے تھے۔ مملکت کا نظام عملاً انہی کی خلافت پر قائم ہو چکا تھا اور امت کی عظیم اکثریت نے ان کی سربراہی تسلیم کر لی تھی۔ اب یہ دعویٰ کرنے کے لیے مکابرہ کی بہت بڑی مقدار درکار ہے کہ اُن کی خلافت مشکوک و مشتبہ تھی اور ان کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کے لیے شرعی جواز کی کوئی گنجائش موجود تھی۔ خصوصاً ان لوگوں پر تو مجھے سخت حیرت ہے جنہیں ایک طرف یزید کی خلافت کو صحیح اور حضرت حسینؓ کو برسرِ غلط ٹھیرانے پر تو بڑا اصرار ہے، مگر دوسری طرف وہ حضرت معاویہ کے حق میں معذرتیں پیش کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ حالانکہ جن دلائل سے یزید کی خلافت صحیح ثابت کی جاتی ہے ان کی بہ نسبت ہزار گنے زیادہ قوی دلائل سے حضرت علیؓ کی خلافت قطعی صحت کے ساتھ قائم ہوئی تھی، اور جن حضرات نے بھی خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے اُن کے خلاف تلوار اٹھائی ان کے اس فعل کے حق میں کوئی شرعی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ خدا کی شریعت بے لاگ ہے۔ اس میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ کسی کے مرتبے کا لحاظ کر کے ہم غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کریں۔

قاتلینِ عثمانؓ کا معاملہ | میں نے شرعی احکام پر جتنا بھی غور کیا ہے اس کی بنا پر میرے نزدیک خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی شرعاً ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ کہ خلیفۂ وقت کی خلافت کو مان کر انہی سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلائیں اور جس

جس کا جو بھی حصہ اس جرمِ عظیم میں تھا، اس کو شہادتوں کے ذریعہ سے متعین کر کے قانون کے مطابق اس کو سزا دیں۔ دوسری طرف اُس وقت کے حالات کا مَیں نے جس قدر بھی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ عملاً یہ قانونی طریق کار اس کے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حضرت علی کے ساتھ سب لوگ تعاون کرتے اور ان کو پُرامن حالات میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا جیسا کہ تاریخی واقعات سے ثابت ہے، جو گروہ سازش کر کے مدینہ پر چڑھ آیا تھا اس کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی۔ خود مدینہ میں بھی ایک تعداد اُن کے حامیوں کی موجود تھی۔ اور مصر، بصرہ اور کوفہ میں بھی ان کی پُشت پر ایک جتھا پایا جاتا تھا۔ اگر تمام اہلِ حق حضرت علی کے گرد جمع ہو جاتے اور ان سے تعاون کرتے تو وہ ان جتھوں کو منتشر کرنے کے بعد ان پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ لیکن جب ایک طرف با اثر صحابہ کے ایک گروہ نے غیر جانب داری کی روش اختیار کی، اور دوسری طرف بصرے اور شام میں طاقت ور فوجیں حضرت علیؓ سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئیں تو ان کے لیے نہ صرف یہ کہ اس گروہ پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا، بلکہ وہ عملاً مجبور ہو گئے کہ اِن طاقت ور فوجوں کے مقابلے میں جن لوگوں سے بھی مدد لے سکتے تھے ان سے مدد لیں اور ایک اور لڑائی قاتلینِ عثمان کے جتھے سے نہ چھیڑ دیں۔ میری اس رائے سے اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ مجھے بتلائے کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمان کے اس مضبوط جتھے کو کس وقت پکڑتے؟ کیا خلافت سنبھالتے ہی فوراً؟ یا جنگِ جمل کے زمانے میں؟ یا جنگِ صفین کے زمانے میں؟ یا جنگِ صفین کے بعد اس زمانے میں جبکہ ایک طرف حضرت معاویہؓ ان کے مقابلے میں مملکت کے ایک ایک صوبے کو توڑ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف خوارج ان کے خلاف صف آرا تھے؟

اجتہادی غلطی کیا ہے اور کیا نہیں ہے اوپر جو کچھ مَیں نے عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن حضرات نے بھی قاتلینِ عثمان سے بدلہ لینے کے لیے خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان کا یہ فعل شرعی حیثیت سے بھی درست نہ تھا، اور تدبیر کے اعتبار سے بھی غلط تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامّل نہیں ہے کہ انہوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی تھی۔ مگر مَیں اسے محض "غلطی" سمجھتا ہوں۔ اس کو "اجتہادی غلطی" ماننے میں مجھے سخت تامّل ہے۔ "اجتہاد" کی اصطلاح کا اطلاق میرے نزدیک صرف اُس رائے پر ہو سکتا ہے جس کے لیے

شریعت میں کوئی گنجائش پائی جاتی ہو، اور "اجتہادی غلطی" ہم صرف اُس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی نہ کوئی شرعی استدلال تو ہو مگر وہ صحیح نہ ہو یا بے حد کمزور ہو۔ اب کوئی صاحب علم براہِ کرم یہ بتا دیں کہ حضرت علیؓ کے خلاف تلوار اٹھانے کے لیے جواز کی کوئی کمزور سے کمزور گنجائش بھی شریعت میں اگر تھی تو وہ آخر کیا تھی؟ جہاں تک جنگِ جمل کا تعلق ہے، معتبر روایات کی رُو سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ، دونوں عین جنگ سے پہلے اپنی غلطی مان کر میدان سے ہٹ گئے تھے، اور حضرت عائشہؓ نے بعد میں اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ رہے حضرت معاویہؓ تو وہ بلاشبہ اپنے آپ کو ہمیشہ حق بجانب سمجھتے رہے۔ مگر ان کی لڑائی کے لیے جواز کی معقول گنجائش آخر کیا قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا یہ کہ نئے خلیفہ نے ایک گورنر کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا؟ یا یہ کہ نئے خلیفہ نے سابق خلیفہ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ نہ چلایا؟ یا یہ کہ نئے خلیفہ پر سابق خلیفہ کے قاتلوں نے غلبہ پا لیا؟ یا یہ کہ نئے خلیفہ کی خلافت ہی ایک صوبے کے گورنر کی رائے میں قانونی طور پر قائم نہیں ہوئی درانحالیکہ مرکز اور تمام دوسرے صوبوں میں اس کی خلافت مانی بھی جا چکی تھی اور عملاً بھی قائم ہو چکی تھی؟ ان میں سے کسی ایک کو بھی خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھانے کی جائز وجہ قرار دینے کے لیے شریعت میں اگر کوئی دور دراز کی گنجائش بھی پائی جاتی ہو تو اسے بیان کر دیا جائے۔ اس معاملہ میں آیت وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا سے استدلال قطعاً غلط ہے۔ اس لیے کہ اس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ اگر خلیفۂ وقت قاتلوں کو گرفتار نہ کرے تو مقتول کے اولیاء کو خلیفہ سے جنگ کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

یہی مشکل حضرت عمروؓ بن العاص کے معاملہ میں بھی پیش آتی ہے۔ جنگِ صفین میں نیزوں پر قرآن اٹھانے کی تجویز، اور پھر دُومۃ الجندل میں تحکیم کی کارروائی تمام معتبر روایات میں جس طرح بیان ہوئی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یہ محض "غلطی" تھی۔ اس کو "اجتہادی غلطی" قرار دینے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ابن سعد نے امام زہری کی روایت نقل کی ہے کہ

جنگِ صِفّین میں جب لڑائی انتہائی شدت اختیار کر گئی اور لوگوں کی ہمت جواب دینے لگی تو حضرت عمروؓ بن عاص نے حضرت معاویہؓ سے کہا: هل انت مطیعی فتامر رجالا ینشر المصاحف ثم یقولون یا اهل العراق ندعوکم الی القرآن، والی ما فی فاتحته الی خاتمته، فانك ان تفعل ذالك یختلف اهل العراق ولا یزید ذالك امر اهل الشام الا استجماعا، فاطاعه "آپ میری بات مانیں تو لوگوں کو حکم دیجیے کہ قرآن کھول کر کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ اے اہلِ عراق، ہم تمہیں قرآن کی طرف بلاتے ہیں، الحمد سے والناس تک اس میں جو کچھ ہے اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے۔ یہ کام آپ کریں گے تو اہلِ عراق میں پھوٹ پڑ جائے گی اور اہلِ شام کی جمعیت بندھی رہے گی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے ان کی تجویز مان لی[1]"۔ یہی بات زیادہ تفصیل کے ساتھ ابن جریر، ابن کثیر، اور ابن اثیر نے بھی نقل کی ہے۔ ان سب کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضرت عمروؓ نے قرآن کو حَکَم بنانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے اس کی مصلحت یہ بیان فرمائی تھی کہ "یا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی یا اگر وہ سب اسے مان بھی گئے تو ہمیں کچھ مدت کے لیے جنگ کو ٹالنے کا موقع مل جائے گا[2]"۔ اس کے سوا قرآن اٹھانے کی کوئی اور غرض، جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی مؤرخ نے بیان نہیں کی ہے۔ اور اس متفقہ بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس تجویز کا مقصد فی الواقع قرآن کی بنیاد پر فیصلہ کرانا نہ تھا، بلکہ اسے صرف ایک جنگی چال کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ کیا اسے واقعی "اجتہاد" کا نام دیا جا سکتا ہے؟ پھر دُومۃ الجَندل میں تحکیم کے موقع پر جو کچھ پیش آیا اس کے متعلق طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، البدایہ والنہایہ اور ابن اثیر کی متفق علیہ روایت یہ ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے درمیان خلوت میں جو بات طے ہوئی تھی، حضرت ابوموسیٰ نے مجمع عام میں آکر اسی کا اعلان کیا، اور حضرت عمروؓ نے اپنا فیصلہ اس کے

[1] طبقات ابن سعد، ج ۴، ص ۲۵۵

[2] الطبری، ج ۴، ص ۳۴۔ البدایہ، ج ۷، ص ۲۷۲۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۶۰

بالکل خلاف پیش کر دیا۔[1] اس رُوداد کو پڑھ کر آخر کون انصاف پسند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ "اجتہاد" تھا؟

یزید کی ولی عہدی کا معاملہ سب سے زیادہ حیرت مجھے اُس استدلال پر ہے جس سے یزید کی ولی عہدی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معترض حضرات یہ تو مانتے ہیں کہ اس کارروائی سے بُرے نتائج برآمد ہوئے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ اگر یزید کو جانشین نامزد کر کے اپنی زندگی ہی میں اس کے لیے بیعت نہ لے لیتے تو اُن کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوتی اور قیصرِ رُوم چڑھ آتا اور اسلامی ریاست ہی کا خاتمہ ہو جاتا، اس لیے ان بدترین نتائج کی بہ نسبت وہ نتائج کمتر ہی بُرے ہیں جو یزید کو ولی عہد بنانے سے رونما ہوئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر فی الواقع حضرت معاویہؓ کا یہ خیال تھا کہ ان کے بعد کہیں جانشینی کے لیے امت میں خانہ جنگی برپا نہ ہو، اور اس بنا پر وہ یہ ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں اس کا فیصلہ کر کے اپنے ولی عہد کے لیے بیعت لے لیں، تو کیا وہ اس نہایت مبارک خیال کو عمل میں لانے کی یہ صورت اختیار نہ فرما سکتے تھے کہ بقایائے صحابہ اور اکابر تابعین کو جمع کرتے، اور ان سے کہتے کہ میری جانشینی کے لیے ایک موزوں آدمی کو میری زندگی ہی میں منتخب کر لو، اور جس کو وہ لوگ منتخب کرتے اس کے حق میں سب سے بیعت لے لیتے؟ اس طریقِ کار میں آخر کیا امر مانع تھا؟ اگر حضرت معاویہؓ یہ راہ اختیار کرتے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خانہ جنگی پھر بھی برپا ہوتی اور قیصرِ روم پھر بھی چڑھ آتا اور اسلامی ریاست کا خاتمہ کر ڈالتا؟

حضرت علیؓ کی بے جا وکالت کا الزام معترض حضرات نے مجھ پر اس شبہ کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ میں حضرت علیؓ کی بے جا وکالت کر رہا ہوں۔ مگر میں صحابۂ کرام، اور خصوصاً خلفائے راشدین کے معاملہ میں اپنا مستقل مسلک پہلے ہی یہ بیان کر چکا ہوں کہ ان کا کوئی قول یا فعل اگر بظاہر غلط محسوس ہوتا ہو تو ان کے اپنے کسی بیان، یا اُس وقت کے ماحول یا ان کے

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۴، ص ۲۵۶-۲۵۷- الطبری، ج ۴، ص ۴۹ تا ۵۲- البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۸۱ تا ۸۳- ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۶۷-۱۶۸

مجموعی طرزِ عمل میں اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور اس کے حق میں ہر وہ معقول تاویل کی جائے جو بے جا اور بھونڈی وکالت کی حد تک نہ پہنچتی ہو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں رسائل و مسائل حصۂ اوّل کے مضمون "حضرت علی کی امیدواریٔ خلافت" اور موجودہ زیر بحث مضمون میں جو رویہ میں نے اختیار کیا ہے وہ دراصل اسی قاعدے پر مبنی ہے کوئی بے جا وکالت نہیں ہے جس کا مجھے طعنہ دیا جا رہا ہے۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ تمام معتبر روایات کی رُو سے شیخین اور حضرت عثمانؓ کے پورے دورِ خلافت میں جس خلوص اور کامل جذبۂ رفاقت کے ساتھ انہوں نے ان تینوں حضرات کے ساتھ تعاون کیا، اور جیسے محبت کے تعلقات ان کے درمیان رہے، اور حضرت ابوبکر و عمر کی وفات کے بعد جس طرح دل کھول کر وہ ان کی تعریفیں کرتے رہے، تو مجھے وہ روایات کمزور محسوس ہوتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے خلیفہ بنائے جانے پر ناراض تھے، اور وہ روایات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے ہر ایک کی خلافت آغاز ہی میں دل سے قبول فرمائی تھی۔ جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، تو آخر ہم اُن روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسبت رکھتی ہیں، اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لیکر خود اُن کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویّہ رہا ہے اس کے ہر جُز کا ایک صحیح محمل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں، یا اس وقت کے حالات و واقعات میں وہ مجھے مل گیا، مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ اِسی بنا پر میں نے اس کی مدافعت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے۔

(بقیہ اشارات)

کا خلاصہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے۔ دوسرے جانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن رہتی ہے۔ تیسرے بعض لوگ اتنے بخیل ہوتے ہیں کہ مال کی محبت اُن کی جان کی محبت پر غالب ہوتی ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کمزوری کے خطرناک نتائج سے خبردار کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے کئی دوسرے مقامات پر نہایت واضح الفاظ میں یہ فرمایا ہے کہ مال کا بخل بسا اوقات اُمت کی تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔ (البقرۃ۔ ۱۹۵) اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

قرآن مجید میں جب صیغۂ جمع حاضر آتا ہے تو کبھی تو افراد مخاطب ہوتے ہیں اور کبھی جماعت یہاں اصل خطاب پوری امت سے بحیثیت مجموعی ہے اور بیان یہ حقیقت ہو رہی ہے کہ افرادِ امت نے اگر جہاد و قتال سے جان چرائی اور مجاہدین کو مالی امداد دینے سے بخل کیا تو نتیجہ لازمی طور پر ساری امت کی تباہی و بربادی اور ہلاکت کی صورت میں رونما ہوگا جس سے وہ افراد بھی نہ بچیں گے جنہوں نے بخل کیا ہو۔

اس آیت کے شانِ نزول میں اس کا جو پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس سے اس کے مضمرات کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں اتری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسلام کو غالب کر دیا تو انصار نے اس نہج پر سوچنا شروع کیا کہ اب جہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لیے انہیں اپنی ساری توجہ اپنے مال و متاع کی حفاظت اور باغوں کی دیکھ

جہاد پر صرف کرنی چاہیے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے محولہ بالا آیت نازل فرمائی۔ یہاں جو یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مال و متاع میں مگن رہیں، اور اُس کے حصول اور حفاظت کے لیے فکرمند رہیں اور جہاد ترک کر دیں[1]۔

دورانِ جہاد شہری آبادی پر جو دیگر فرائض عائد ہوتے ہیں اُن میں سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ مالک الملک کی تائید و نصرت کے لیے اُس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو، اپنے عساکر کی فتح اور دشمن کی شکست کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگے اور ایسی تمام حرکات اور ایسے تمام افعال سے پُوری طرح اجتناب کرے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہیں۔ عوام کے اندر باہمی تعاون، ہمدردی، جذبۂ ایثار اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک پوری قوم یک جان ہو کر اپنی تمام قوتوں کو منظم طریق سے ایک راہ پر نہیں لگاتی اس وقت تک اس آزمائش میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ جس طرح مجاہدوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دشمن کے مقابلے میں پوری طرح ثابت قدم رہیں اسی طرح شہری آبادی پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی سراسیمہ نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اگر وہ سراسیمگی کا شکار ہو گئی تو میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔ دوسری جنگِ عظیم میں فرانس کی شکست میں اتنا دخل فوج کی کمزوری کا نہ تھا جتنا کہ عوام کی بزدلی کا تھا۔ ہٹلر کے پہلے حملے کے ساتھ ہی پُوری قوم سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی پوری انتظامی مشینری یکسر معطل ہو کر رہ گئی۔ شاہراہوں پر لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے فوج کی نقل و حرکت میں شدید دشواری پیش آئی اور اس طرح یہ قوم اپنی بزدلی کی وجہ سے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ لڑائی کو حدیث میں ڈول سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سمت اور رُخ بدلتے رہتے ہیں اس لیے دشمن کے فوری دباؤ کو دیکھ کر

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الجہاد: باب فی قولہ عزوجل وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُم ...

انسان کو قطعی پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنے خالق و مالک کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہماری سپاہ کو اتنی طاقت دی کہ اُس نے تعداد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود دشمن کے چھکے چھڑا دیئے ہیں اور جرأت، بلند حوصلگی، صبر و ثبات کے بعض ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں جنہیں دیکھ کر صدرِ اوّل کے مجاہدوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہماری فوج انشاء اللہ ملک کی حفاظت اور دشمن کی شکست کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی اور اس معاملے میں بفضلِ ایزدی کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کرے گی لیکن اس کے ساتھ ہم پر بھی خدا کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اُسے تقویت بہم پہنچانے کا پوری طرح سامان کریں۔ اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے اُس کے حوصلے پست ہونے کا خطرہ ہو۔

سول سروس کو "دفاع کا سلسلۂ ثانی" کہا جاتا ہے۔ جتنی یہ سروس مستعد ہو گی اتنا ہی دفاع مضبوط ہو گا۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ سول سروس کے ارکان ان مخدوش حالات میں اپنی ذمہ داریوں کا پوری طرح احساس کریں اور زیادہ مستعد، ایماندار اور ہمدرد بن کر قوم کی خدمت کریں۔ جنگ کے دوران عوام کو بلشمار مصائب اور تکلیفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر سول سروس انہیں دُور کرنے میں تعاون نہ کرے تو اس سے عوام کے اندر بددلی پھیلتی ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ انگلستان نے دوسری جنگِ عظیم میں عوام اور سول سروس کے بے مثال تعاون کی وجہ سے فتح حاصل کی ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم ایک گزارش اس ملک کے طبقۂ امراء سے بھی کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ وقت ایثار کا ہے، ناجائز انتفاع کا نہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو بے پناہ دولت اس کے ہاتھ لگی ہے وہ اس کے حُسنِ تدبر کا نتیجہ نہیں بلکہ آزادی کا ثمرہ ہے۔ اسے اس آزادی کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ ایثار کرنا چاہیے۔ یُوں تو اس کے لیے خدمت کرنے کے کئی میدان کھلے ہیں لیکن خاص طور پر اسے چار باتوں کی طرف پُوری توجہ دینا چاہیے۔ اوّل یہ کہ

قومی دفاعی فنڈ میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع ہو تاکہ ہماری کوئی جنگی ضرورت محض روپے کی کمی کی وجہ سے پوری ہونے سے نہ رہ جائے۔

دوسرے اس امر کا التزام کہ جنگ کے دوران منافع خور قوم پر عذاب بن کر مسلط نہ ہو سکیں۔ جنگ کی وجہ سے چونکہ اشیاء کی قلت ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے بعض ظالم اور سنگ دل سرمایہ دار اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چور بازاری شروع کر دیتے ہیں۔ اس ذہنیت کا مظاہرہ کرنے والوں کی جتنی بھی حوصلہ شکنی کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ قوم کے ساتھ اس سے بڑی غداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے نوجوان تو اپنی جانوں پر کھیل کر وطن کی حفاظت کریں اور یہ طالع آزما اس سنگین صورت حال میں عوام کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہوں۔

تیسرے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ چند ماہ یا چند سال بھی کارخانے بند کر دیتے ہیں تو انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ انہوں نے پہلے ہی سے اپنے پاس اتنی کثیر دولت سمیٹ رکھی ہوتی ہے کہ وہ بغیر کچھ مزید کمائے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے ہر قسم کی آسائشیں اور تعیشات فراہم کر سکتے ہیں لیکن مزدوروں کی حالت ان سے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اُن بیچاروں کے معاوضے اتنے کم ہوتے ہیں کہ وہ بمشکل اپنے جسم و جان کے رشتہ کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس بیکاری کے دنوں کے لیے کوئی اثاثہ نہیں ہوتا۔ اب اگر سرمایہ دار اپنے مفادات اور مصالح کی وجہ سے کارخانہ بند کر دیتا ہے تو نہ صرف لاکھوں مزدور بیکار ہو جاتے ہیں بلکہ اُن کے خاندانوں پر بھی مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ سرمایہ دار سُود و زیاں کے نقطۂ نظر سے سوچنے کی جگہ اِن حالات میں خالص انسانی نقطۂ نظر سے معاملہ کرے اور کام میں تعطّل نہ پیدا ہونے دے تاکہ معاشی زندگی کی جوئے رواں حیاتِ اجتماعی کے سارے شعبوں کو حسبِ معمول سیراب کرتی رہے اور کسی گوشے میں بھی محرومی کا کوئی اثر نمایاں نہ ہونے پائے۔

اس جنگ میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہیں ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دوسری

مرتبہ گھر بار چھوڑنا پڑا ہے۔ ان میں سے کافی تعداد ان بے کسوں کی ہے جو شدید مصائب کا شکار ہیں۔ ان کے حوصلے بلاشبہ بلند اور ارادے مضبوط ہیں مگر گھر بار لٹنے کی وجہ سے وہ اس وقت انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ ان کی اعانت اور دستگیری کی بھی اشد ضرورت ہے ملک کے زرداروں کو ان کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔

یہ پوری قوم کے لیے امتحان کا وقت ہے۔ یہ ہمارے ایمان باللہ کے دعوی کا امتحان ہے۔ ہمارے تدبر و تفکر کا امتحان ہے۔ ہماری بصیرت اور فہم و فراست کا امتحان ہے۔ ہمارے خلوص اور صبر و ثبات کا امتحان ہے۔ اس امتحان میں کامیابی پر ہی ہمیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کی توقع ہو سکتی ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

ان سطور کی کتابت ہو چکی تھی کہ یو، این، او کی سلامتی کونسل اور دنیا بھر کی قوموں کے اصرار پر پاکستان کو جنگ بندی کا اعلان کرنا پڑا۔ ہمارے نزدیک سلامتی کونسل کی وہ قرارداد جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے وہ بالکل مبہم اور غیر واضح ہے اور اس سے اس امر کی ضمانت نہیں ملتی کہ مسئلہ کشمیر کا تصفیہ یو، این، او کی پہلی قراردادوں اور خود ہندوستان کے اپنے تسلیم کردہ

بین الاقوامی فیصلوں کے مطابق استصواب کی بنیاد پر ہوگا۔ نیز اس میں یہ وضاحت بھی موجود نہیں کہ اس نازک مسئلہ کا حل آخر کب اور کس وقت کیا جائے گا۔ ان حالات میں پاکستانی عوام کے ذہنوں میں امن کے اس ادارہ کی نیت کے بارے میں مختلف خدشات کا پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ کسی فرد یا ادارہ پر اس کے گذشتہ کردار اور طرزِ عمل سے ہی اعتماد پیدا ہوتا ہے اور وہ اگر ایک مرتبہ متزلزل ہو جائے تو مشکل ہی سے بحال ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات بڑے دکھ اور افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ پاکستان کے عوام اور دنیا کی دوسری انصاف پسند قومیں یو، این، او کے طرزِ عمل کے بارے میں اپنے دل و دماغ میں بڑی تلخ یادیں رکھتی ہیں۔ وہ یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ جس سلامتی کونسل نے ۱۸ سال تک اس مسئلہ کو کھٹائی میں ڈالے رکھا اور قوت و طاقت کے باوجود اس کے حل کرنے کے لیے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا وہ اب اسے اپنے مخصوص مصالح کے پیش نظر ایک غیر معیّن عرصہ کے لیے پھر تعویق میں ڈال سکتی ہے۔

ایسی مبہم قرارداد کی بنیاد پر بلا تعیّنِ مدت جنگ بندی کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جنگ بندی لائن کے اُس پار ہندوستان کو کشمیری مسلمانوں کے استیصال اور کشمیر کو ہضم کرنے کا پھر موقع مل جائے جیسا کہ پہلے سالہا سال سے اس کو ملتا رہا ہے۔ ان خدشات کی بنا پر ہماری رائے تو یہ تھی کہ سلامتی کونسل کی طرف سے کشمیر کے مسئلے میں استصواب رائے کی غیر مبہم قرارداد اور استصواب کی تاریخ کے واضح تعیّن کے بغیر جنگ بندی نہ ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اب جبکہ سلامتی کونسل کی قرارداد کی بنیاد پر ہماری حکومت نے جنگ بندی قبول کر لی ہے اور اس کے ساتھ ہمارے وزیر خارجہ نے بالکل واضح الفاظ میں اس مسئلہ کے حل کے لیے تین ماہ کی مدت کا اعلان کر دیا ہے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جس امید پر یہ کام کیا گیا ہے وہ بااحسن طریق پایۂ تکمیل تک پہنچے اور یہ مسئلہ جنگ و جدال سے نہیں بلکہ پُر امن طریق سے حق و انصاف کے تقاضوں کے مطابق طے ہو جائے۔ سلامتی کونسل کے لیے اپنے مجروح اعتماد کو بحال کرنے کا یہ ایک نادر موقع ہے۔ اگر اس نے قوت، جرأت، تدبّر اور انصاف سے کام لے کر اس سلسلہ میں کوئی مؤثر

قدم اٹھایا تو نہ صرف پاک و ہند کی سرزمین خون ریزی سے بچ جائے گی بلکہ یو۔این۔او کے وقار میں بھی اضافہ ہوگا اور قومیں بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے نزاعی امور کے فیصلے کے لیے اس کی طرف رجوع کریں گی۔ لیکن اگر اس نے اس نازک وقت میں بڑے ممالک کے سامراجی عزائم کی پاسبانی کرتے ہوئے حق و انصاف کا خون کیا تو اس کی ساکھ کو ایک ایسا شدید نقصان پہنچے گا جس کی تلافی شاید ممکن نہ ہو۔

دنیا کا کوئی شخص جو اپنے اندر کوئی معمولی اخلاقی حس بھی رکھتا ہو، ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں امن کی خواہش نہ ہو۔ اور یہ بات تو ایک لمحہ کے لیے بھی تصور نہیں کی جاسکتی کہ ایک مسلمان جسے اخلاق کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کے لیے دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، کبھی یہ پسند کرے گا کہ جو کام پُرامن طریق سے طے کرنا کسی طرح بھی ممکن ہو اُس کے لیے جنگ کو دعوت دے۔ خونریزی کوئی پسندیدہ مشغلہ نہیں ہے بلکہ انتہائی مجبوری کی حالت ہی میں اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب دنیا کی ظالم طاقتیں مسلمان کے لیے جینا محال کر دیں، جب قوت و طاقت کے زعم میں وہ اُس کے جائز حقوق پر دست درازی کرنا شروع کر دیں تو پھر اسلام اس قدم کو جرأت اور مردانگی سے اٹھانے کی تلقین کرتا ہے۔ حق و انصاف کا خون انسانوں کے خون سے زیادہ افسوسناک اور دُور رس نتائج کا حامل ہے۔ افراد کے خون سے انسانوں کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے مگر حق و انصاف کے خون سے پُوری انسانیت کا چراغ گُل ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اسلام نے حق کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے انسانی جان تک کو قربان کر دینے کی ہدایت کی ہے۔

پاکستان کی حکومت اور اس کے باشندوں کو بڑی چوکسی اور بیدار مغزی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ امنِ عالم کی علمبردار تنظیم حق و انصاف کے تقاضوں کو کس طرح پُورا کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُنہیں اس بات کے لیے

بھی ہر وقت تیار رہنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ یو، این، او نے اپنی سابقہ روش کے مطابق ٹال مٹول کی پالیسی اختیار کی اور مدت مقررہ کے اندر مسئلہ کشمیر کا کوئی منصفانہ حل تلاش کرنے میں کوتاہی برتی تو پھر محض اللہ کے بھروسے پر، حق و انصاف کے حصول کے لیے انہیں خود آگے بڑھنا ہوگا اور اہلِ کشمیر کو جبر و استبداد سے نجات دلانی ہوگی۔

اہل پاکستان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس وقت صرف آتشباری بند ہوگئی ہے، اہل کشمیر کو ان کا حقِ خود ارادیت دلوانے کے لیے جو جہاد شروع ہوا تھا وہ ختم نہیں ہوگیا ہے۔ بطنِ مستقبل میں کیا پنہاں ہے اس کے بارے میں کوئی چیز بھی حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن حالات کا دھارا جس رُخ بہ رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ چیز قطعاً بعید از قیاس نہیں کہ کسی وقت پہلے سے بھی بڑے اور شدید تصادم کی نوبت آجائے۔ اس بنا پر یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ جنگ بندی کے باوجود جہاد کے سلسلے کی تمام سرگرمیوں کو نہ صرف پوری طرح جاری رکھا جائے بلکہ انہیں تیز تر کر دیا جائے۔ خاص طور پر ان مخدوش حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا جو ایک عام جذبہ سارے ملک میں اُبھر آیا ہے اُسے نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ مزید نشو و نما دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اس جنگ میں دشمن کے مقابلے میں جو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی ہے، اُس میں ہماری کسی طاقت اور ہنر مندی کو دخل نہیں بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کی رحمت کی رہینِ منت ہے۔ اس لیے اپنے خالق و مالک کے ساتھ ہمیں اپنے تعلق کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہیے۔ یہ تعلق جتنا گہرا ہوگا اتنے ہی زیادہ ہم قادرِ مطلق کی رحمت و نصرت کے مستحق ہونگے اور اسی نسبت سے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہوتے چلے جائیں گے۔

حکومت کو بھی یہ موقع غنیمت سمجھ کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور ملک کے باشندوں کو جنگ کے لیے پوری طرح تیار کرنا چاہیے۔ ان حالات میں یہ انتہائی ضروری

ہے کہ وہ ایک طرف اُن سارے منکرات کو مٹانے کی فکر کرے جو قوم کے اندر عیش پسندی، سہل انگاری، اور فسق و فجور کو پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسری طرف وہ ساری تدابیر عمل میں لائے جن سے ملک کے سارے طبقوں میں دشمن سے نبرد آزما ہونے کی قوت و طاقت پیدا ہو سکے۔

مطبوعات

ماہنامہ "سیارہ" اشاعتِ خاص مدیر جناب ابو السلام نعیم صدیقی۔ شائع کردہ: دفتر سیارہ ۶-بی، ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور۔ قیمت سوا دو روپے۔ صفحات ۲۳۸

یہ مجلہ حلقہ ادبِ اسلامی کے نامور ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی کے اونچے اور ستھرے ادبی ذوق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس مجلہ نے مختصر سی مدت میں جو قابلِ قدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی نظر سے یہ برابر گزرتا رہا ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارہ اس کی اشاعت خاص ہے۔ اس میں اس کے فاضل مدیر نے شعر و ادب کی جو محفل سجائی ہے اُس میں قریب قریب وہ تمام شخصیتیں شریک ہیں جنہیں فکری، اور ادبی میدان میں شہرت اور ناموری حاصل ہے۔

"میرا مطالعہ" کے تحت پاک و ہند کے مشہور اہلِ علم اور اہلِ دانش نے اپنے جو تاثرات اور تجربات بیان فرمائے ہیں وہ نہ صرف فکر انگیز ہیں بلکہ مطالعہ کے شائقین، اُن سے عملی رہنمائی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ معیار طباعت اونچا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر کتابت کی غلطیاں نظر سے گزریں۔

قرآن ازم جلد اوّل، حصہ مکّی
قرآن ازم جلد اوّل۔ حصہ مدنی
تالیف: جناب غلام احمد صاحب۔ شائع کردہ دار الاشاعت قرآن ازم ۲۲-۱-۸۶۷ سلطان پورہ حیدر آباد نمبر ۲ قیمت حصہ مکّی۔ چھ روپے۔ حصہ مدنی دس روپے۔

قرآن مجید کی سنتِ نبوی، اُس کے اپنے پس منظر اور اس کی لغت سے یکسر بے نیاز ہو کر

صرف اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق تعبیر و تشریح کی جس قدر کوششیں کی گئی ہیں اور اُن کے نتیجے میں جو فکری و ذہنی انتشار رونما ہوا ہے، یہ کوشش اس کا واضح نمونہ ہے۔ فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے انسانی عقل سے پر تعصبات کے سارے پردوں کو ہٹا کر قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور اس جمود کو توڑا ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے افکار پر پڑا ہوا ہے لیکن جس آزادیٔ فکر کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہے اُس سے قرآن مجید کے مطالب و معانی یکسر بدل کر رہ گئے ہیں اور بعض ایسی تصریحات سامنے آئی ہیں جس سے پورے دین کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ انہوں نے تو یہ کام اس لیے کیا ہے کہ کورانہ تقلید کے پردوں کو چاک کر کے آزادانہ اجتہاد کی راہ نکالی جائے لیکن اگر اس طرزِ فکر کو اپنایا جائے تو اسلام کی ایک ایسی تعبیر سامنے آئے گی جس کی قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ سے کوئی توثیق نہیں ہوتی۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے دین میں سنّتِ نبوی اور تعامل صحابہ کو نظر انداز کر کے جو نئی راہیں پیدا کی گئیں وہ یکسر غلط اور گمراہ کن تھیں اور انہوں نے امت کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ فاضل مصنف کی نیت خواہ کتنی ہی نیک اور ان کا جذبہ خواہ کتنا پاکیزہ ہو لیکن ہم اس طرزِ فکر کی کبھی تائید نہیں کر سکتے بلکہ اسے امت کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ البتہ جو لوگ راسخ العلم ہیں اور وہ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر میں آزادیٔ فکر کے نتائج دیکھنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

معیار طباعت اوسط درجہ کا ہے اور اسلوب بیان میں کافی الجھاؤ پایا جاتا ہے۔

(ع - ح - ص)

رجسٹرڈ ایل لاہور ۷۳۴۰

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء، طلباء، قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

الجہاد فی الاسلام

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷/۵۰ روپے

سنت کی آئینی حیثیت

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- سنت کیا ہے؟
- سنتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنتِ نبوی کی صحت، حفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث و سنت کے اعتراضات کا مدلل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت قیمت ۸/۰۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مترجمہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل
- معاندینِ اسلام کے پروپیگنڈہ کا مدلل جواب۔

۔۔۔ صفحات ۔۔۔ قیمت صرف ۷/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلیے صحیح نصب العین اور طریقہ کار کی نشاندہی
- برصغیر ہند و پاک کی پچیس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

بہترین کتابت و طباعت، نفیس ڈسٹ کور قیمت مجلد ۱۰/۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

" سستا " ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور